ولایت

اور

رہبری

تالیف

علامہ سید محمد حسین طباطبائیؒ

مترجم

محمد خالد فاروقی

ولایت

اور

رہبری

تالیف

علامہ سید محمد حسین طباطبائیؒ

مترجم

محمد خالد فاروقی

بسم اللہ الرحمن الرحیم
۱۳۷۴

شروع کرتا ہوں اللہ کے نام سے جو رحمٰن و رحیم ہے

انصاریان پبلیکیشنز

پوسٹ بکس نمبر ۱۸۷ـ۳۷۱۸۵

قم جمہوری اسلامی ایران

ٹیلی فون نمبر ۲۱۷۴۴

فہرست

۱

ولایت اور رہبری

بسمہ تعالیٰ

عرض ناشر

احکام اسلامی اور اخلاق و آداب کا جاننا ہر مسلمان فرد کے لئے لازم ہے لیکن ہمارے یہاں یہ موضوع عدم توجہی کے باعث نئی نسل کے ذوق و شوق کو متوجہ نہیں کر سکا نتیجۃً دینی تعلیم بچوں کے لئے ایک اضافی مضمون سے زیادہ اہمیت حاصل نہ کر سکی۔

زیر نظر کتاب میں مؤلف نے فلسفیانہ دلائل کی جگہ قرآنی طرز استدلال کو اپنایا ہے تاکہ قاری مطالب کی گہرائی تک پہنچ جائے اور یوں اس کے اندر نور ایمان پیدا ہو سکے کہ اسی قسم کا ایمان مضبوط و مستحکم اور پائیدار ہوتا ہے

خدائے بزرگ و برتر بتصدیق آئمہ معصومینؑ ہماری اس سعی کو قبول فرمائے

آپ کی گرانقدر آراء کا منتظر

محمد تقی انصاریان

۱- ولایت کے معنیٰ

ہم سب انسان ایک طویل مدّت سے اِس زمین پر زندگی بسر کر رہے ہیں ——— ہم نے توالد و تناسل کا ایک سلسلہ اس دنیا میں قائم کیا اور اجتماعی اور تمدنی زندگی بسر کرنے کی راہ اختیار کی اور پورے معاشرے کی فلاح و بہبود کے لیے مل کر جدوجہد کی اور ہر شخص کو اپنی اہمیت اور شخصیت کے مطابق اس اجتماعی محنت کے اچھے نتائج کا حصہ ملتا رہا۔

اب تک جو کچھ ہم نے حاصل کیا وہ ہماری اجتماعیت کا نتیجہ ہے۔ افراد کی طرف سے اپنی انفرادیت اور مکمل خودمختاری کے خاتمے کے بغیر نہ ایسا معاشرہ وجود میں آسکتا تھا اور نہ ترقی کی یہ منزلیں انسان طے کر سکتا تھا ———

انسانی معاشرہ کا رکن بننے اور باہمی تعاون اور شرکت کی راہ اختیار کرنے کے بعد کوئی بھی شخص نہ مطلق العنان ہو سکتا ہے نہ اسے ایسی آزادی مل سکتی ہے کہ ———

وہ جو چاہے کرے اور اسے کوئی روکنے والا نہ ہو۔

اس سب کے باوجود ———

اگر انسانی زندگی تھوڑی بہت انفرادیت کی حامل نہ ہو تو اس کی اصلیت ثابت نہیں ہوگی۔ انسانوں کی انفرادیت ہی معاشرہ ہے ———

اور انسان و معاشرہ لازم و ملزوم ہے۔

معاشرے کا انحصار، انسان کے انفرادی شعور و ارادے پر ہے۔

اگر انفرادی شعور و ارادے کو انسان سے سلب کر لیا جائے تو معاشرہ بھی تباہ ہو جائے گا اور اس کے ارکان بھی ختم ہو جائیں گے۔ (وہ چاہے جیسا بھی معاشرہ ہو)

ہر شخص معاشرتی زندگی کی گود میں پلتے اور بڑھتے ہوئے ایسے کام بھی انجام دیتا ہے جو اس کی اپنی ذات اور شخصیت سے متعلق ہوں ———

لیکن بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ بعض افراد اپنے ذاتی کام انجام دینے کے بھی قابل نہیں رہتے، جیسے وہ لوگ جو ذہنی طور پر بیمار ہوں اور جن کے حواس پراگندہ ہوں یا وہ دوسروں کی بہ نسبت ارادہ و شعور کی کم طاقت رکھتے ہوں۔ ایسی صورت میں دوسرے انسانوں کو ان کی دیکھ بھال کا کام انجام دینا پڑتا ہے۔ اور ان کی خدمت کرنی پڑتی ہے۔

اسی طرح بچے جب تک بڑے اور بالغ نہیں ہو جاتے ———

ان کے بڑوں کو ———

ان کی نگہبانی کرنی پڑتی ہے اور ان کی تعلیم و تربیت کا انتظام کرنا پڑتا ہے تاکہ وہ مکمل مرد اور عورت بن کر معاشرہ میں اپنا کردار ادا کر سکیں۔

اسی طرح ہر انسانی معاشرہ میں ———

ایسے ادارے بھی ہوتے ہیں جن سے نہ کوئی خاص طبقہ استفادہ کرتا ہے اور نہ کوئی خاص طبقہ ان اداروں کا سربراہ ہوتا ہے بلکہ یہ ادارے عام

لوگوں کے فائدے کے لیے ہوتے ہیں جیسے اوقافِ عامہ کے ادارے ۔

اصل چیز یہ ہے کہ ———

کسی بھی انسانی معاشرہ کے لیے نگہبانی اور تحفظ کا ایک نظام ضروری ہوتا ہے چونکہ کوئی بھی انسانی معاشرہ اس وقت تک قائم اور باقی نہیں رہ سکتا جب تک کہ اس کے افراد متفقہ طور پر یا اکثریت کے ذریعہ ———

کچھ قوانین وضوابط اور طریقے وضع نہ کریں اور سب مل کر ان کا احترام نہ کریں مثلاً : ———

خرید و فروخت کے معاملات ہی کو لے لیجیے ———

جن میں خریدار کو اور فروخت کرنے والے کو کچھ شرائط کی پابندی کرنی پڑتی ہے ،

اگر یہ طے کر لیا جائے کہ دونوں میں سے کسی کو کسی بات کی پابندی نہیں کرنی ہوگی تو شاید ہی کوئی عقل وفہم رکھنے والا ایسے کسی تجارتی معاملہ میں فریق بننا پسند کرے ——— !

اسی طرح وسائل زندگی کا مسئلہ ہے ۔ اجتماعی زندگی بسر کرنے والا انسان بے شمار وسائل کو استعمال کر کے ہی اپنی اور معاشرہ کی ضروریات پوری کرتا ہے ۔

ان وسائل کے استعمال کے لیے ایسے قواعد و قوانین کی ضرورت ہوتی ہے جو متفقہ طور پر یا اکثریت کی منظوری سے وضع کیے گئے ہوں ۔ کوئی بھی معاشرہ قوانین و ضوابط اور رسوم و رواج کے بغیر زندہ و باقی نہیں رہ سکتا ۔

قوانین اور رسوم رواج کی اس اہمیت کے باوجود یہ کہنا درست ہوگا کہ کسی بھی معاشرہ کی بقا کے لیے صرف قوانین اور رسوم و رواج کافی نہیں ہونے کیونکہ کوئی دو آدمی بھی اپنے مزاج ——— سمجھ بوجھ ——— قوت ارادی —

اور اسی طرح اپنے طرز عمل میں ہر اعتبار سے مماثلت نہیں رکھتے ———

بنیادی افکار میں اتفاق رکھنے کے باوجود لوگ ان کی تفصیلات میں قطعی طور پر ایک دوسرے سے اختلاف رکھتے ہیں اور اسی لیے ان کے فیصلے بھی ایک جیسے نہیں ہوتے ،

نتیجتہً وہ مختلف سمتوں کا رُخ کریں گے اور پھر تمام قوانین اور رسم و رواج درہم برہم ہو جائیں گے ۔

اس زمین پر انسانی زندگی کی تاریخ کا مطالعہ اور مختلف معاشروں اور ان میں قائم ہونے والی حکومتوں کا مشاہدہ بھی اس بات کی تائید کرتا ہے ———

کہ ہر معاشرہ کو اپنی بقا کے لیے ———

ایک ایسے شخص یا بااختیار ادارے کی ضرورت ہوتی ہے ———

جس کا شعور اور ارادہ ———

دیگر افرادِ معاشرہ کے شعور اور ارادے پر غالب رہے اور نگہبانی و تحفظ کے اس نظام کو چلائے جو اس معاشرہ میں قائم کیا گیا ہے ۔

ہم نے انسانی زندگی کے جن گوشوں اور شعبوں کا ذکر کیا ہے وہ تمام انسانی معاشروں میں دیکھے جا سکتے ہیں اور انسان اپنی خداداد فطرت کی بنا پر ان سے بے توجہی نہیں برت سکتا اور مطمئن ہو کر نہیں بیٹھ سکتا ———

وہ زندگی کے ہر شعبے کے لیے کسی شخص یا کسی ادارے کو ذمہ دار قرار دے گا تاکہ وہ اس کی دیکھ بھال کرے اور اس کے تمام امور کو انجام دے ———

مثلاً ———

کسی یتیم خانے کا سربراہ یتیموں کا سرپرست ہوتا ہے ———

اور خاندان کا سربراہ گھر کے تمام کمسن بچوں کی بہبود کا ذمہ دار

ہوتا ہے ———

اسی طرح وزارتِ اوقاف یا محکمۂ اوقاف ———

اوقافِ عامہ کے امور کو انجام دیتا ہے ——— بادشاہ یا صدرِ جمہوریہ

کاروبارِ حکومت کو چلاتا ہے ———

ہم ایسے شخص یا ادارے کو،

جو عام لوگوں کے امور کا ذمہ دار ہوتا ہے اور ان کی فلاح و بہبود کے لیے خدمات انجام دیتا ہے اسے اور اس کے کام کو،

"ولایت" کا نام دیتے ہیں ———؛

ولایت کے وہی معنی ہیں جو سرپرستی کے ہیں ———

۲- بحث کا انداز

ولایت کا یہی وہ معنی اور مفہوم ہے جو ہمارے اس مقالے کی بحث کا موضوع ہے ———

ہم اس بارے میں

اسلام کے مقدس آئین کا نقطۂ نظر پیش کرنا چاہتے ہیں۔ لیکن ہم جو کچھ پیش کریں گے وہ اسلام کے فلسفۂ اجتماعی کی روشنی میں پیش کریں گے

اور ہمارا طرزِ استدلال،

اسلامی فقہ کا خصوصاً شیعہ فقہ کا طرزِ استدلال نہیں ہوگا ———

——— جو لوگ شیعہ فقہ سے واقف ہیں وہ دیکھیں گے کہ اس مقالہ کی بحث کا انداز اس طرزِ استدلال سے بہت مختلف ہے جو احکامِ شریعت سے متعلق فقہی مباحث کے اندر اختیار کیا جاتا ہے۔

۳- ولایت ایک فطری مسئلہ ہے

جیسا کہ ہم پہلے وضاحت کر چکے ہیں،

ولایت (حکومت) کا تعلق،

انسان کے ضروری اور بنیادی امور سے ہے۔ ان امور سے غفلت نہیں برتی جاسکتی ———

حکومت کسی خاص شخص کی جاگیر نہیں ہے کہ وہ اس کا اہل اور مستحق نہ بھی ہو اور پھر بھی امورِ عامہ کی باگ ڈور اپنے ہاتھ میں لیے رہے۔

جیسے یتامیٰ اور مساکین کے اموال کا انتظام ———

مجنون اور پاگل افراد کی دیکھ بھال ———

حکومت سے تعلق رکھنے والے ایسے امورِ عامہ کہ جنھیں کسی اہل منتظم کے نہ ہونے کی بنا پر پراگندگی اور بدنظمی کے حوالے نہیں کیا جاسکتا۔

کوئی بھی انسانی معاشرہ خواہ وہ ترقی یافتہ ہو یا پسماندہ ———

بڑا ہو یا چھوٹا ———

اس طرح کے مفادِ عامہ کے امور سے غفلت نہیں برت سکتا چنانچہ ہر معاشرہ اپنے حالات کے مطابق ایک ولایت و قیادت کو وجود میں لاتا ہے۔

ولایت (رہبری و سرپرستی) کے فطری ہونے کا ایک بڑا ثبوت یہ ہے کہ انسان اپنی خداداد فطرت کی بنا پر ———

ہر ایسے ضروری کام کے لیے

جس کا کوئی منتظم نہ ہو ایک سرپرست مقرر کرتا ہے۔

۴ - ولایت اسلامی نقطۂ نظر سے

اسلام دینِ فطرت ہے ——
اس کے احکام و قوانین کی بنیاد فطرت پر رکھی گئی ہے ——
ظاہر ہے ایک دینِ فطرت، ولایت جیسے فطری مسئلے سے کس طرح بے توجہی برت سکتا ہے اور اسے کس طرح مسترد کر سکتا ہے ——؟
قرآن نے اس مسئلے کی اہمیت واضح کرنے کے لیے ایک فرمان جاری کیا ہے ——

ارشادِ خداوندی ہے :

"فَاَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّيْنِ حَنِيْفًا ۭ
فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِيْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا ۭ
لَا تَبْدِيْلَ لِخَلْقِ اللّٰهِ ۭ ذٰلِكَ الدِّيْنُ
الْقَيِّمُ ڎ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ"

(سورہ روم آیت ۳۰)

"پوری طرح یکسو ہو کر اپنا رُخ دینِ اسلام کی طرف جما دو اور قائم ہو جاؤ اس فطرت پر جس پر اللہ تعالیٰ نے انسانوں کو پیدا کیا ہے۔ اللہ کی بنائی ہوئی ساخت بدلی نہیں جا سکتی۔ یہی بالکل راست اور درست دین ہے۔ مگر اکثر لوگ نہیں جانتے ہیں۔"

توضیح

جیسا کہ بعض آیاتِ قرآنی میں آچکا ہے۔ یہ حیرت انگیز وسعت و عظمت رکھنے والی کائنات ——
اپنا ایک واحد وجود رکھتی ہے —— یہ ایک ایسی اکائی ہے
اور —— ایسی وحدت کی حامل ہے ——
کہ ——
اس کے تمام اجزا —— ایک ننھے ذرے سے لے کر ——
بڑے سے بڑے سیارے ——
اور عظیم سے عظیم کہکشاں تک سب ایک دوسرے سے بندھے ہوئے ہیں اور باہم مربوط اور ایک دوسرے کے ساتھ پیوست ہیں ——
—— اور وہ ایک دوسرے پر اثر ڈالتے ہیں اور ایک دوسرے سے متاثر ہوتے رہتے ہیں ——
اس دائرۂ زندگی میں جو بھی چھوٹی یا بڑی چیز داخل ہوتی ہے یا اس میں جو بھی تبدیلی رونما ہوتی ہے اس میں کائنات کے تمام اجزا کا کم و بیش حصہ ضرور رہتا ہے ——
انسان بھی کائنات کے ان اجزا کا ایک جز ہے، اس لیے وہ دوسرے اجزا سے الگ نہیں ہو سکتا ——
اس کی حیثیت سمندر کے ایک قطرہ کی سی ہے۔ وہ سمندر کی موجوں اور طوفان کے ہاتھوں مجبور و محکوم ہے۔ وہ اس کائنات کے اجزا سے کٹ کر کوئی انفرادی استقلال و استحکام نہیں رکھتا۔ نہ سب سے الگ ہو کر اپنا کوئی منفرد

کام انجام دے سکتا ہے ۔

اس وسیع کائنات کا نظام جو مسلسل حرکت و عمل میں ہے ۔ ہر لمحہ عمومی تبدیلیاں رونما کر کے موجودات و مخلوقات میں سے ہر مخلوق کو اس کے نقطۂ کمال پر پہنچاتا ہے اور اس مقصد کی جانب رہنمائی کرتا ہے جس کے لیے اسے وجود عطا کیا گیا ہے ——

جیسا کہ ہم دیکھتے ہیں ——

ہر مخلوق کو فطرت کی طرف سے خاص قوتوں اور وسائل کے ساتھ لیس کیا گیا ہے —— اور یہ قوتیں اور یہ وسائل اس کے مقصدِ زندگی کے ساتھ بڑی مناسبت رکھتے ہیں ——

چنانچہ تمام مخلوقات ان قوتوں اور وسائل کو کام میں لا کر اپنی ضروریات پوری کرتی ہیں اور اپنے نقائص کو دور کر کے درجۂ کمال تک پہنچنے کی کوشش کرتی ہیں ۔

مندرجہ ذیل آیات میں جو بات عمومی طور پر کہی گئی اس سے ہمارے اس بیان کی بہترین تائید ہوتی ہے :

" اَلَّذِیْٓ اَعْطٰی كُلَّ شَیْءٍ خَلْقَهٗ ثُمَّ هَدٰی "

(سورۂ طٰہٰ آیت ۵۰)

" ہمارا رب وہ ہے جس نے ہر چیز کو اس کی ساخت بخشی پھر اس کو راستہ بتایا "

" اَلَّذِیْ خَلَقَ فَسَوّٰی ۝ وَالَّذِیْ قَدَّرَ فَهَدٰی ۝

" جس نے پیدا کیا اور تناسب قائم کیا۔ جس نے تقدیر بنائی، پھر راہ دکھائی ۔

(سورہ اعلیٰ آیت ۲، ۳)

اس سے ہم یہ نتیجہ حاصل کرتے ہیں کہ ——

انسان کو ہمیشہ فطری الہام و ہدایت کے ذریعہ خیر و شر اور اپنے نفع و نقصان کو سمجھنا چاہیے کیونکہ انسان اس کائنات کا ایک مستقل جزء ہے اور تخلیقِ عامہ سے الگ نہیں بلکہ اس کا ایک حصّہ ہے ——

اور یہ عالمِ فطرت اپنے ہر جزء کو اس منزلِ کمال تک پہنچاتا ہے ، جو اس کے لائق ہے ——

اور چونکہ انسان کا تعلق ایک ایسی خاص نوع سے ہے ، جو اپنے شعور و ارادے کے ساتھ اپنے مقاصدِ زندگی کے لیے جد و جہد کرتی ہے ——

یہی وجہ ہے کہ ——

فطری الہام ، علوم و افکار کی صورت میں اس پر جلوہ گر ہوتا ہے ۔ جیسا کہ آیۂ کریمہ میں ارشاد ہوا ہے :

" وَنَفْسٍ وَّمَا سَوّٰهَا ۝ فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰهَا ۝ قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰهَا ۝ وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰهَا ۝

(سورہ شمس آیات ۷ تا ۱۰)

" اور نفسِ انسانی کی اور اس ذات کی قسم جس نے اسے ہموار اور پھر اس کی بدی اور اس کی پرہیزگاری اس پر الہام کر دی ، یقیناً فلاح پا گیا وہ جس نے نفس

کا تزکیہ کیا اور نامراد ہوا وہ جس نے اس کو دبا دیا "

گزشتہ بحث سے یہ بات واضح ہو چکی ہے کہ انسان کو فطری الہام و ہدایت اور علم و افکار سے آراستہ کیا گیا ہے جو زندگی کی جدوجہد میں اسے کامیابی کی ضمانت دیتے ہیں اور ان کی رہنمائی میں راستہ طے کر کے انسان نظامِ فطرت کے ساتھ ہم آہنگی پیدا کرتا ہے۔

اس صورت میں اس کے عمل اور کائنات کی ——

عمومی حرکت کے درمیان ——

کوئی ایسا اختلاف و تضاد باقی نہیں رہتا جو خود اس کے وجود کے لیے تباہ کن ثابت ہو۔

یہی وہ بات ہے جو حق سبحانہ، تعالیٰ نے اس آیت میں بیان فرمائی ہے:

" فَاَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّيْنِ حَنِيْفًا ۭ
فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِيْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا ۭ
لَا تَبْدِيْلَ لِخَلْقِ اللّٰهِ ۭ ذٰلِكَ الدِّيْنُ
الْقَيِّمُ ۔"

(سورہ روم آیت ۳۰)

پہلی بات تو یہ ہے کہ جب انسان کی خوش نصیبی حقیقت و فطرت کی راہ اختیار کرنے سے وابستہ ہے تو پھر معاشرہ میں اس طریقِ زندگی کا رواج ہونا چاہیے جو کائنات کی عام خلقت اور انسان کی خصوصی فطرت کو اپنا سرچشمہ بنائے اور ان دونوں سے وہ پوری طرح ہم آہنگ ہو۔

دوسری بات یہ ہے کہ ——

نظامِ فطرت مستحکم اور مضبوط ہے اس لیے جو کامل دین اور طریقۂ زندگی

اسے اپنا سرچشمہ بنائے گا وہ بھی اپنی جگہ مستحکم اور مضبوط ہونا چاہیے۔

اس کے برعکس ——

جس طریقِ زندگی کی بنیاد خواہشِ نفس ہو گی ——

وہ ہر روز ایک نیا رنگ اختیار کرے گا۔ نتیجتاً انسان راہِ راست سے فطرتاً واقف ہونے کے باوجود غلط راہ پر پڑ جائے گا اور شعوری یا غیر شعوری طور پر پستی اور بدبختی کے گڑھے میں جا گرے گا ——

جیسا کہ اللہ سبحانہ تعالیٰ نے ایک دوسری آیتِ کریمہ میں ارشاد فرمایا ہے:

" اَفَرَءَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰهَهٗ هَوٰىهُ
وَاَضَلَّهُ اللّٰهُ عَلٰي عِلْمٍ ۔"

(سورہ جاثیہ آیت ۲۳)

" پھر کیا تم نے اس شخص کے حال پر بھی غور کیا جس نے اپنی خواہشِ نفس کو اپنا خدا بنا لیا اور اللہ نے علم کے باوجود اسے گمراہی میں پھینک دیا۔"

اسی طرح کی دوسری بہت سی آیات، انسان کو آگاہ کرتی ہیں کہ اس کا طریقِ زندگی حق کے تابع ہونا چاہیے ——

ہویٰ و ہوس کے تابع نہیں ہونا چاہیے ——

اسے عقلِ سلیم کا حکم ماننا چاہیے نہ کہ نفسانی خواہشات کا۔

" فَمَاذَا بَعْدَ الْحَقِّ اِلَّا الضَّلٰلُ ۚ

" پھر حق کے بعد گمراہی کے سوا اور کیا باقی رہ گیا۔؟"

(سورہ یونس۔ آیت ۳۲)

تیسری بات یہ ہے کہ ——
قوانینِ فطرت کی مخالفت دراصل کائنات کے نظامِ تخلیق و ربوبیت
کے ساتھ جنگ کرنا ہے ——
یہ عظیم الشان اور طاقتور نظام بالآخر اپنے ساتھ پنجہ آزمائی کرنے والے
انسان کو یا تو نیست و نابود کر دیتا ہے —— یا —— اسے مغلوب کرکے
اپنی راہ پر لے آتا ہے ——
دینِ فطرت کی مخالفت کرنے والے انسان کو ——
ایک سخت دن کا ——
اور المناک عذاب کا منتظر رہنا چاہیئے —— !
سورۂ روم کی متذکرہ بالا آیت کے بعد جو آیات آتی ہیں ان میں
اسی بات کی طرف اشارہ فرمایا گیا ہے۔

اصل موضوع

اسلام کی بنیاد فطرت پر رکھی گئی ہے۔
اسی کلی اصول کی بنا پر اسلام نے ضروری فطری احکام جاری کیے
ہیں، فطری ضروریات میں ایک ضروری مسئلہ کا تعلق مسئلۂ ولایت سے ہے۔
یہ بات بالکل واضح رہی ہے کہ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی
حیاتِ مبارکہ کے دوران ——
خصوصاً ہجرت کے بعد ——
ولایت کے تمام شعبے جیسے امورِ عامہ —— گورنروں اور قاضیوں
کا تقرر —— صدقات اور اوقاف اور عام تعلیم و تربیت اور مبلغین کو

مختلف علاقوں میں بھیجنا ——
ایسے ہی دوسرے تمام کام اور شعبے ایک نظم کے تحت منظّم تھے اس
لیے مسلمانوں نے اجتماعی زندگی کے اس لازمی اصول 'ولایت' کے بارے میں
حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے کوئی سوال نہیں کیا ——
جبکہ وہ اس سے کم اہمیت رکھنے والی ——
—— متعدد چیزوں کے بارے میں پوچھتے رہے تھے۔
جیسے حیض —— رویتِ ہلال —— اور —— انفاق
کے مسائل کے بارے میں انھوں نے سوالات کیے ——
اور ان کے بارے میں آیاتِ قرآنی نازل ہوئیں ——
اسی طرح سقیفہ کا واقعہ بھی اس اصول کی تائید کرتا ہے ——
رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رحلت کے دن جبکہ ابھی آپ کے جسدِ
مبارک کی تدفین نہیں ہوئی تھی ——
مہاجر اور انصار صحابہ کی ایک تعداد جسدِ مقدّس کو چھوڑ کر ——
سقیفہ بنی ساعدہ میں ——
خلیفہ کے انتخاب کے لیے جمع ہو گئی تھی۔
اس اجتماع میں متعدد عام نوعیت کی تجویزیں پیش کی گئیں کسی نے کہا کہ
خلیفہ کو انصار میں سے ہونا چاہیئے ——
دوسرے نے خلیفہ کے مہاجرین میں سے ہونے پر زور دیا۔
کسی تیسرے صحابی نے کہا کہ ——
"انصار میں سے ایک کو امیر بنایا جائے اور مہاجرین
میں سے ایک کو —"

کسی نے بھی یہ نہیں کہا کہ خلیفہ کا منتخب کرنا ضروری نہیں ہے ——
یا یہ کہ ——
اسلام کا یہ کوئی لازمی اصول نہیں ہے ——

سب اسے ضروری اور لازمی سمجھتے تھے۔ اس کا سبب بجز اس کے اور کچھ نہیں تھا کہ سب اپنی فطری رہنمائی کی بنا پر یہ سمجھتے تھے کہ اسلامی معاشرہ کا پہیہ خود بخود گردش نہیں کرے گا جب تک اسے گھمانے والا کوئی موجود نہ ہو۔

دینِ اسلام نے اس ہدایت کو کہ مسلمانوں کے درمیان ایک حکومت موجود ہونی چاہیئے قطعی انداز میں جاری کیا ہے۔

اس کی دوسری دلیل یہ آیتِ کریمہ ہے

"اَفَاۡئِنْ مَّاتَ اَوْ قُتِلَ انْقَلَبْتُمْ
عَلٰٓى اَعْقَابِكُمْ ؕ وَمَنْ يَّنْقَلِبْ
عَلٰى عَقِبَيْهِ فَلَنْ يَّضُرَّ اللّٰهَ شَيْـًٔا ؕ
وَسَيَجْزِى اللّٰهُ الشّٰكِرِيْنَ"

(سورہ آلِ عمران آیت ۱۴۴)

"(محمدؐ اس کے سوا کچھ نہیں کہ بس ایک رسولؐ ہیں ان سے پہلے اور رسول بھی گزر چکے ہیں) پھر کیا اگر وہ مر جائیں یا قتل کر دیے جائیں تو تم لوگ الٹے پاؤں پھر جاؤ گے۔ یاد رکھو جو الٹا پھرے گا وہ اللہ کا کچھ نقصان نہ کرے گا البتہ جو اللہ کے شکر گزار بندے بن کر رہیں گے انھیں وہ اس کی جزا دے گا۔"

شانِ نزول کے بارے میں یہ بات مسلمہ ہے کہ یہ آیتِ کریمہ جنگِ احد کے موقع

پر اور مسلمانوں کی شکست کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔

احد کے روز رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو دشمن کی طرف سے اچانک صدمہ پہنچا اور فوراً ہی یہ افواہ پھیل گئی کہ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مارے گئے

اسی افواہ کی بنا پر بجز چند لوگوں کے لشکرِ اسلام کے اکثر افراد نے یہ سوچ کر کہ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وفات کے بعد جنگ کو جاری رکھنا بیکار ہے جنگ سے اپنے ہاتھ روک لیے تھے اور شکست خوردہ ہو کر فرار کی راہ اختیار کی تھی۔

اللہ تعالیٰ نے اس سلسلے میں یہ آیتِ کریمہ نازل فرمائی اور مسلمانوں کو مخاطب فرماتے ہوئے ان کی شکست خوردگی پر ان کی سرزنش فرمائی کہ ——

محمدؐ ان دوسرے پیغمبروں کی طرح ایک پیغمبر ہیں ——
جو پہلے آئے تھے ——
اور لوگوں کو اسلام کی طرف بلایا تھا ——
پھر وہ اس دنیا سے رخصت ہو گئے —— محمدؐ بھی اسی طرح رخصت ہو جائیں گے ——
وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے تمھارے درمیان نہیں رہیں گے ——
اور یہ دین بھی خدا کا دین ہے، محمدؐ کا اپنا دین نہیں ہے کہ ان کے رخصت ہونے سے یہ دین بھی رخصت ہو جائے۔
وہ صرف وساطت و رسالت کا منصب رکھتے ہیں ——
—— کیا اگر وہ کسی روز وفات پا جائیں یا قتل کر دیے جائیں ——
تو تم ——
دین سے روگردانی اختیار کر لو گے ——؟

جیساکہ سب کو معلوم ہے ——
مسلمانوں کی اس جماعت نے شکست کی وجہ سے دوبارہ بتوں کی پرستش شروع نہیں کردی تھی اور انھوں نے نماز اور روزے کو ترک نہیں کر دیا تھا ——

صرف انھوں نے یہ کہا تھا کہ ——
رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وفات پانے کے بعد ہم آخر کس لیے جنگ کریں۔ وہ دین کے ایک فریضے کو یعنی نظامِ حکمرانی کے قیام کے فریضے کو جو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حیاتِ مبارکہ کے دوران قائم تھا —— آپ کے بعد ترک کردینا چاہتے تھے ——

اللہ تعالیٰ نے اس بارے میں ان کی سرزنش فرمائی اور صرف محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے قتل کا ذکر نہیں کیا بلکہ آپؐ کی طبعی موت کا بھی ذکر فرماتے ہوئے تنبیہ فرمائی کہ ——

رسول اکرمؐ کے اس دنیا سے رخصت ہونے کے بعد (خواہ وہ طبعی موت کے نتیجے میں رخصت ہوں یا قتل کی وجہ سے) ——
ان کی وہ سنت جو ان کی بعثت کے ساتھ ہی وجود میں آئی تھی اسے پوری طرح باقی اور محفوظ رہنا چاہیے اور اسے کسی صورت میں ترک نہیں کیا جانا چاہیے۔ کیونکہ محمدؐ ایک رسول سے زیادہ اور کچھ نہیں ہیں اور ——
دین، خدا کا دین ہے ——
جب تک خدا، خدا ہے، دین بھی اسی کا ہے۔
رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد ولایت و رہبری کا نظام قیامت تک زندہ رہنا چاہیے۔ اسلامی معاشرہ کا فرض ہے کہ وہ ایک رہنما حکومت

برقرار کرے اور اسے قائم رکھے اور اس کے تحت تعلیم و تربیت، تبلیغ و اشاعت، مالیات، دفاع، اقتصادیات اور عدل و انصاف کے اور اجتماعی زندگی کے ایسے ہی دوسرے شعبوں کو منظم کرے اور ان کے امور کو انجام دیتا رہے۔
آیت کریمہ نے ولایت کا قیام مسلمانوں کے لیے لازمی قرار دیا ہے اور ہدایت کی ہے کہ اسلام کے نظامِ اجتماعی کے تمام شعبے ——
اسی طرح قائم اور زندہ رہنے چاہئیں ——

جیسے وہ ——
رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زندگی میں تھے —— یعنی منصبِ ولایت کا یہ کام ہے کہ وہ ان احکام و قوانین کو ——
جنھیں شریعت کا نام دیا گیا ہے اور جن میں کوئی تغیر نہیں کیا جاسکتا جاری اور نافذ کرے اور ان قوانین کی خلاف ورزی کرنے والوں کو واضح دینی احکام کے مطابق سزا دے اور اسلامی معاشرہ کے اجتماعی نظام کے مختلف شعبوں کا نظم و نسق چلانے کے لیے ——
اسلام اور مسلمانوں کے مفاد کا جو بھی تقاضا ہو ——
اس کے تحت ایسے احکام و فرامین جاری کرے جو مصلحتوں میں تبدیلی کے ساتھ حسبِ ضرورت تبدیل کیے جاسکتے ہیں ——

وہ احکام جو ولایت کے تحت جاری ہوتے ہیں:

جیسا کہ سطورِ بالا میں اشارہ کیا گیا ہے۔ اسلامی معاشرہ میں جو احکام وقوانین جاری ہوتے ہیں وہ دو قسم کے ہیں۔

ایک احکامِ ثابتہ جو ناقابلِ تغیر ہیں ———

اور دوسرے وہ احکام و قوانین ہیں جو قابلِ تغیر ہیں ———

اس بات کی وضاحت کے لیے ہم ایک ایسے شخص کی مثال لیتے ہیں جو ایک ملک کا شہری اور اپنے خاندان کا سربراہ ہے۔

وہ معاشرہ میں اپنی حیثیت کے مطابق اس بات کا ذمہ دار ہے کہ اپنے چھوٹے سے خاندان کی دیکھ بھال کرے اور زندگی کے بہتر مقاصد کی طرف اس کی رہنمائی کرے۔

وہ ملک کے عام لازمی قوانین کے زیرِ سایہ اپنے قومی حقوق سے استفادہ کرتے ہوئے اپنے خاندان کے دائرے میں رہ کر ضروری فیصلے اور اقدامات کرسکتا ہے۔ وہ اپنے خاندان کے ہر فرد کو کسی مناسب کام کے لیے مقرر کرسکتا ہے اور کسی کام سے اسے الگ کرسکتا ہے ———

وہ اہلِ خاندان کی خوراک، پوشاک اور سکونت کے بارے میں انھیں خصوصی ہدایت دے سکتا ہے یا کسی خاص ہدایت کو مصلحتِ وقت کے مطابق منسوخ کرسکتا ہے۔

وہ کسی بھی دن کو ان کے لیے تعطیل قرار دے سکتا ہے یا کسی دن ان کے کام کے گھنٹوں میں اضافہ کرسکتا ہے ———

اگر کوئی شخص اس کی عزت اور اس کے مال پر

حملہ کرے تو ———

وہ اپنا دفاع کرسکتا ہے ——— یا خاموش رہ کر اپنی بھلائی اسی میں دیکھ سکتا ہے کہ حملہ آور کے خلاف مزاحمت نہ کرے۔ لیکن وہ کسی بھی صورت میں ملک کے لازماً جاری ہونے والے قوانین کی خلاف ورزی نہیں کرسکتا۔

اور اپنی قانونی ذمہ داریوں کے دائرے سے باہر قدم نہیں نکال سکتا۔

یہ بات ظاہر ہے کہ اس خاندان کے دائرے میں جو احکام و ضوابط نافذ ہیں دو قسم کے ہیں ———

ایک لازماً جاری ہونے والے ملکی ضوابط جن میں تبدیلی لانے کا یہ خاندان اختیار نہیں رکھتا ———

دوسرے وہ لازمی ضوابط ہیں جو اس خاندان کے سرپرست نے خود جاری کیے ہیں۔ ان میں خاندان کا سربراہ مختلف مصالح کی بنا پر تبدیلی لاسکتا ہے

دینی نظام اور اسلامی معاشرہ کے ساتھ ———

ولایت یا حکومتِ اسلامی کو وہی تعلق و نسبت حاصل ہے جو خاندان کے سربراہ کو دوسرے افرادِ خاندان کے ساتھ حاصل ہوتی ہے۔

اسلام کے آسمانی احکام جو وحی کے ذریعہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر نازل ہوئے جنھیں ہم شریعتِ اسلامی اور ———

احکامِ خداوندی کا نام دیتے ہیں۔

کتاب و سنت کے قطعی بیانات کے مطابق ایسے مستقل قوانین ہیں جو ناقابلِ تغیر ہیں اور ان کی خلاف ورزی کرنے والوں پر ولایتِ اسلامی کے ہاتھوں سزا نافذ کی جاتی ہے اور قوانینِ شریعت کے سائے میں اور ان سے مطابقت اختیار کرتے ہوئے (ولی امر) مصلحتِ وقت کے تحت ———

کچھ فیصلے اور اقدامات عمل میں لاسکتا ہے ———

اور ان کے مطابق ضوابط وضع کرکے انھیں حسبِ موقع نافذ کرسکتا ہے۔

ان ضوابط کا نفاذ لازمی نوعیت کا ہوتا ہے۔

اور شریعت کی طرح وہ قابلِ احترام و اعتبار ہوتے ہیں ———
لیکن ———
اس فرق کے ساتھ کہ آسمانی قوانین مستقل اور ناقابلِ تغیر ہوتے ہیں۔
جبکہ وضع شدہ ضوابط قابلِ تغیر اور ان کا باقی رہنا اس مصلحت کے تابع ہوتا ہے جس کے سبب وہ وضع کیے گئے تھے۔

کیونکہ انسانی معاشرہ کی زندگی میں ہر وقت تبدیلی آتی رہتی ہے اور وہ اپنی تکمیل کی جانب گامزن رہتی ہے۔

اس لیے یہ وضع شدہ ضوابط بھی تدریجاً تبدیل ہوتے رہتے ہیں اور بہتر ضوابط کے لیے اپنی جگہ خالی کرتے رہتے ہیں ———
اس بحث سے چند نکات حاصل ہوتے ہیں ———

پہلا نکتہ

جیسا کہ معلوم ہو چکا ہے اسلامی قوانین کی دو اقسام ہیں۔ دوسرے الفاظ میں اسلامی معاشرہ پر دو طرح کے قوانین نافذ ہوتے ہیں۔

پہلی قسم ان آسمانی احکام اور قوانینِ شریعت کی ہے جو ناقابلِ تغیر ہیں۔
اور جن کے نفاذ کے مواقع بھی مستقل اور متعین ہیں۔ یہ قوانین اس سلسلۂ احکام سے تعلق رکھتے ہیں جو آسمانی وحی کے ذریعہ اور دینِ فطرت کے نام سے رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر نازل ہوئے ———
اور ناقابلِ تنسیخ ہیں ———

اور انسانی معاشرہ پر ان کا نفاذ ہمیشہ لازم اور واجب ہے۔ جیسا کہ اس آیتِ قرآنی میں ارشاد ہوا ہے :

"فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِیْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَیْهَا ؕ لَا تَبْدِیْلَ لِخَلْقِ اللّٰهِ ؕ ذٰلِكَ الدِّیْنُ الْقَیِّمُ"

اور سنتِ نبویؐ میں بھی یہ وارد ہوا ہے

"حلال محمد حلال الیٰ یوم القیامۃ وحرام محمد حرام الیٰ یوم القیامۃ۔"

البتہ آج کے مفکرین کے ذہن میں یہ بات موجود ہے کہ انسانی معاشرہ تغیّر و ارتقاء کے عام اصول کے تحت تبدیلیوں کی زد میں رہتا ہے۔

اس لیے جاری قوانین و احکام میں بھی تمدن کی ترقی کے مطابق تبدیلی ہوتی رہنی چاہیے۔

اس شبہے کا تفصیلی جواب اور شریعتِ اسلامی کے ہر قانون کی دوامی اور ابدی روح کی تشریح کرنا اس مقالے کی حدود سے باہر ہے لیکن مختصراً یہ بتانا ضروری ہے کہ کچھ حقیقی اور فطری انسانی ضروریات مستقل نوعیت کی ہوتی ہیں۔

یہ بات ظاہر ہے کہ تمام انسانی حاجات و ضروریات قابلِ تغیر اور تبدیلیوں کے زیرِ اثر نہیں ہوتیں۔ ہم احتیاجات کا ایک ایسا سلسلہ بھی رکھتے ہیں جو مستقل نوعیت کی ہیں۔ ہمیں ان مدنی قوانین میں بہت سے مستقل نوعیت کے قوانین ملتے ہیں ———
جیسے اجتماعی زندگی کا لازم ہونا ———
مقدسات کی حفاظت ———
اور دفاع کا اصول ، مالی استقرار کا اصول ، حکومت کی تأسیس کا اصول اور ایسے ہی دوسرے اصول۔

کسی بھی قانون اور کسی بھی اجتماعی نظام میں کچھ مستقل ضوابط رکھے بغیر کوئی چارہ نہیں ہے اور اسلام جن قوانین کو مستقل اور ناقابل تغیر قرار دیتا ہے ان کے مجموعے کو شریعت کا نام دیا گیا ہے۔

دوسری قسم ان قوانین کی ہے ـــــــ

جو منصبِ ولایت کی طرف سے مصلحت وقت کے مطابق وضع کر کے نافذ کیے جاتے ہیں ـــــ البتہ اس نوع کے قوانین کا بقا و زوال، وقت کے تقاضوں کے تابع ہوتا ہے۔ اور لازماً مدنیت کی ترقی اور مصالح و مفاسد کی تبدیلی کے ساتھ ان میں تغیّر و تبدّل آتا ہے ـــــ

بلا شبہ ولایت کا اصول حکمِ آسمانی اور شریعت کے قانون سے لیا گیا ہے اس لیے وہ ناقابلِ تغیر اور ناقابلِ تنسیخ ہے۔

دوسرا نکتہ

اسلامی معاشرہ اپنے دو قسم کے قوانین،

مستقل قوانین ـــــ اور ـــــ قابلِ تغیر قوانین کی وجہ سے جمہوری معاشروں کے ساتھ ایک طرح کی شباہت رکھتا ہے۔

جمہوری معاشروں میں دو قسم کے قوانین ہوتے ہیں ـــــ

پہلی قسم مستقل قوانین کی ہے جنھیں آئین و دستور کا نام دیا جاتا ہے جن میں تبدیلی لانا قانون ساز اسمبلی اور سینٹ کے اختیار میں بھی نہیں ہوتا۔

یہ صرف عوام ہی کی استصواب کے ذریعے یا مجلسِ دستور ساز کو وجود میں لا کر آئین کی کسی دفع میں تبدیلی لا سکتے ہیں یا اسے منسوخ کر سکتے ہیں۔

قوانین کی دوسری قسم وہ ہے جو اسمبلی یا سینٹ اور دوسرے بعض مراکز میں

وضع کیے جاتے ہیں اور نافذ کیے جاتے ہیں، ان کی حیثیت "قانون آئین" کی دفعات کی وقتی تشریح کی سی ہوتی ہے۔

قوانین کی یہ قسم قابلِ تغیّر ہے۔

تاہم یہ شبہ نہیں کیا جانا چاہیے کہ اسلام کا طریقہ اپنی اس آزادی کی خصوصیت کے ساتھ ایک طرح سے جمہوری یا اشتراکی روش رکھتا ہے جیسا کہ بعض اہلِ قلم کی تحریروں سے ظاہر ہوتا ہے ـــــ

اسلامی طریقہ نہ ڈیموکریسی کا طریقہ ہے نہ سوشلزم کا طریقہ۔

اسلام اپنے دونوں قسم کے قوانین میں دوسرے اجتماعی طریقوں اور سوشلسٹ طریقوں کے ساتھ زبردست اختلاف رکھتا ہے۔

اسلام کے مستقل قوانین کا وضع کرنے والا خود اللہ سبحانہٗ تعالیٰ ہے۔ جبکہ دوسرے اجتماعی نظاموں میں مستقل قوانین وضع کرنے والے عوام ہوتے ہیں یا کوئی پارٹی ہوتی ہے۔

اسی طرح قابلِ تغیر قوانین کا معاملہ ہے ـــــ

دوسرے نظاموں میں ان قوانین کی بنیاد اکثریت کی خواہش ہوتی ہے دوسرے الفاظ میں اقلیت (جو ایک کم نصف کے برابر ہوتی ہے) کے شعور اور مرضی کو ـــــ

اکثریت (جو ایک جمع نصف کے برابر ہوتی ہے) کی خواہش و پسند پر قربان کر دیا جاتا ہے۔ خواہ اس کی پسند حق کے مطابق ہو یا نہ ہو۔

اس کے برعکس ـــــ

اسلامی معاشرہ میں قابل تغیر قوانین بلاشبہ لوگوں کی مجلسِ شوریٰ میں وضع کیے جاتے ہیں لیکن ان کی بنیاد حق ہوتی ہے نہ کہ اکثریت کی خواہش،

وہ حقیقت پسندی پر مبنی ہوتے ہیں نہ کہ خواہشات و میلانات پر۔

اسلامی معاشرہ میں اسلام اور مسلمانوں کی حقیقی بھلائی اور حق کا نفاذ ہونا چاہیے ——— خواہ اس کا نفاذ اکثریت کی خواہش کے خلاف ہی کیوں نہ ہو،

ایک اسلامی معاشرہ میں اسلام جو علم و تقویٰ پیدا کرتا ہے، اس کی بنا پر اکثریت کبھی بھی حق و حقیقت پر اپنی ہوس آمیز خواہشات کو ترجیح نہیں دے گی

اللہ تعالیٰ نے اپنے آسمانی فرامین میں حق کی پیروی کا حکم دیا ہے اور اسے انسان کی کامیابی کا ضامن قرار دیا ہے ——— اور غیر حق کی پیروی سے منع کیا ہے خواہ تمام لوگوں کی خواہشات یا اکثریت کی خواہش اس کی تائید کیوں نہ کرے۔

"فَمَاذَا بَعْدَ الْحَقِّ اِلَّا الضَّلٰلُ"

"پھر حق کے بعد گمراہی کے سوا اور کیا رہ گیا۔"

(سورہ یونس آیت ۳۲)

"قُلِ اللّٰهُ يَهْدِيْ لِلْحَقِّ ۭ اَفَمَنْ يَّهْدِيْٓ اِلَى الْحَقِّ اَحَقُّ اَنْ يُّتَّبَعَ اَمَّنْ لَّا يَهِدِّيْٓ اِلَّآ اَنْ يُّهْدٰى۔"

"کہو وہ صرف اللہ ہے جو حق کی طرف رہنمائی کرتا ہے پھر بھلا بتاؤ جو حق کی طرف رہنمائی کرتا ہے وہ اس کا زیادہ مستحق ہے کہ اس کی پیروی کی جائے یا وہ جو خود راہ نہیں پاتا الا یہ کہ اس کی رہنمائی کی جائے۔

(سورہ یونس آیت ۳۵)

"لقد جئنٰکم بالحق ولکن اکثرکم للحق کٰرھون۔"

"ہم تمھارے پاس حق لے کر آئے تھے مگر تم میں سے اکثر کو حق ہی ناگوار تھا۔

(سورۂ زخرف آیت ۷۸)

"هُوَ الَّذِيْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ"

"وہی تو ہے جس نے اپنے رسول کو ہدایت اور دینِ حق کے ساتھ بھیجا ہے۔"

(سورہ صف آیت ۹)

"وَالْعَصْرِ ۝ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِيْ خُسْرٍ ۝ اِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ ڏ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ ۝

"زمانے کی قسم انسان درحقیقت خسارے میں ہے سوائے ان لوگوں کے جو ایمان لائے اور نیک عمل کرتے رہے اور ایک دوسرے کو حق کی نصیحت اور صبر کی تلقین کرتے رہے۔

(سورۃ العصر)

دانشوروں کی ایک تعداد اسلام کے نظام پر اعتراض کرتے ہوئے یہی نکتہ اٹھاتی ہے اس کا کہنا ہے کہ صرف وہی طریقہ عوام کے نزدیک قابلِ قبول ہو سکتا ہے اور ان کے درمیان جاری ہو سکتا ہے جو ان کی اکثریت کی پسند اور خواہش کے مطابق ہو۔

جبکہ اسلام میں یہ چیز موجود نہیں ہے ۔

عملاً ہم نے یہ مشاہدہ بھی کیا ہے کہ ——————

اسلامی قوانین بہت تھوڑی مدت کے لیے نافذ رہے ہیں ——————

جب کہ جمہوری نظاموں کے نفاذ نے دوام حاصل کرلیا ہے اور مسلسل کئی صدیوں سے یہ نظام دنیا میں قائم ہیں اور چل رہے ہیں ——————

روز بروز ان میں استحکام پیدا ہو رہا ہے اور ان کی خوبیوں میں اضافہ ہوتا جا رہا ہے اور ہوتا رہے گا ۔

دوسری طرف نظامِ اسلام کے بارے میں زیادہ سے زیادہ جو بات کہی جا سکتی ہے وہ یہ ہے کہ ——————

آج سے چودہ سو سال پہلے کے حالات میں اس نظام کو بلاشبہ ایک کامل نظام کی حیثیت حاصل تھی لیکن اب جبکہ چودہ سو سال سے زیادہ کا عرصہ گزر چکا ہے اور اس عرصے میں انسانی معاشروں نے زبردست ترقی کرلی ہے ——————

اسلام کا نظام موجودہ حالات سے ——————

—————— ہم آہنگ نہیں ہو سکتا ۔

اس اعتراض کے جواب میں ہم یہ کہیں گے :

پہلی بات تو یہ ہے کہ اکثریت کی خواہش کا انکار نہیں کیا جا سکتا لیکن یہ بات بلا تردید کہی جا سکتی ہے کہ اکثریت کی خواہش کا تعلق اس سوال سے ہے کہ ——

معاشرہ میں عمومی تعلیم و تربیت کی نوعیت کیا ہے ؟

کیونکہ اکثریت کی خواہش کے اچھے یا برے ہونے کا انحصار عام تعلیم و تربیت پر ہوتا ہے ۔ یہ اجتماعیت اور نفسیات پر ہونے والی کافی بحثوں کے بعد پوری طرح واضح ہو چکی ہے ——————

اسلام اپنے معاشرہ میں خداشناسی اور تقویٰ کا جو ماحول پیدا کرتا ہے اس کے ہوتے ہوئے یہ ممکن نہیں کہ ——————

اکثریت، عقلِ سلیم کو ہوا و ہوس کے تابع بنا دے ——————

اور حق و حقیقت کو اپنی خواہش و پسند پر قربان کر دے ——

اسلامی معاشرے میں اکثریت ہمیشہ حق کا ساتھ دے گی ۔ ——————

—————— اسی طرح دنیا کے ترقی یافتہ اور پسماندہ معاشروں میں جس طرح کا ماحول پیدا کیا جاتا ہے ، اکثریت کی خواہش اسی ماحول کے مطابق اور اسی معاشرہ کی عادات اور عام مقاصد کے مطابق ہوتی ہے ——————

البتہ ، ہر نیا نظام ——————

جو کسی معاشرہ میں قائم کیا جاتا ہے وہ اپنے آغاز میں اکثریت کی خواہش کے مطابق نہیں ہوتا ۔ اور جو جماعت اس نظام کو قائم کرتی ہے اسے اکثریت کی حمایت حاصل نہیں ہوتی ۔

یہ بات صرف اسلام کے نظام ہی کے بارے میں درست نہیں ہے ——

بلکہ ——————

دنیا کے تمام نظاموں کے ساتھ یہی صورتِ حال پیش آتی ہے ۔

موجودہ آزاد اور بے قید و بند تعلیم و تربیت کے نظام کو قائم رکھتے ہوئے ، اسلام پر یہ اعتراض کرنا کہ وہ قابلِ قبول نہیں ہے ایک بڑی غلط فہمی ہے ۔

دوسری بات یہ ہے کہ ——————

مسلمانوں کے درمیان اسلامی نظام کا ختم ہو جانا کچھ اس طرح نہیں ہوا کہ وہ اپنے قائم ہونے کے چند سال بعد رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے زمانے ہی میں اپنی عمرِ طبعی کو پہنچ گیا ہو ——————

اسلامی تاریخ کے واقعات اس بات کے بہترین گواہ ہیں کہ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رحلت کے بعد جو اسلام کا ایک مجسم نمونہ تھے اسلام کے مثالی طریقے کو ختم کر کے دوسرے طریقوں کو اس کی جگہ نافذ کیا گیا ——

رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اسوہ کی پیروی کی بجائے عملاً کچھ دوسرے نمونوں کی پیروی شروع کر دی گئی اور کچھ ہی عرصے بعد ——

اسلامی طریقے اور سنّت کی بجائے ——

—— ایک مکمل عرب سلطنت قائم کر دی گئی۔

اسلام کے اس طرح رخصت ہونے کو اس کی موت کا نام دیا جاتا ہے۔
حالانکہ اسے اس کے قتل اور شہادت کا نام دیا جانا چاہیئے۔

نظامِ اسلام کو اپنے آغاز میں بڑی زبردست قبولیت حاصل ہوئی پھر کچھ برسوں کے گزرنے کے بعد اسے مفلوج کر دیا گیا۔ اس صورتِ حال کی بنیاد پر یہ کہنا صحیح نہ ہوگا کہ ——

لوگوں نے اسلام کو مسترد کر دیا تھا ——

اسلام کے نظام کو کتاب وسنّت اور رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سیرتِ پاک سے سمجھنا چاہیئے ——

اس کے ساتھ اسلام کے نام پر ——

قائم ہونے والی حکومتوں کے ان شرمناک کارناموں کا دقیق مطالعہ کرنا چاہیئے جو تاریخ کے صفحات پر پھیلے ہوئے ہیں ——

اسلام کا حقیقی نظام کس اسلامی معاشرہ میں نافذ کیا گیا تھا کہ ہم یہ کہہ سکیں کہ ——

انسانی معاشرے نے یا اس کی اکثریت نے اسلامی طرزِ زندگی کو قبول

نہیں کیا —— ؟

کیا ہمیں یہ کہنا چاہیئے (جیسا کہ بعض لوگوں نے کہا ہے) ——
—— کہ مسلمانوں کے ناشائستہ اعمال اس بات کی دلیل بن گئے کہ ان کے دین کے طریقے کو بھی ناشائستہ سمجھا جائے؟

اس طرح کی مشکلات سے صرف اسلام کا نظام ہی دوچار نہیں ہوا ہے دوسرے جمہوری نظاموں کو بھی ایسی مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

جمہوریت کے دستور اور طرزِ حکومت کو اپنائے ہوئے ہمیں نصف صدی سے زیادہ کا عرصہ ہو چکا ہے اور ہم متمدن مغربی جمہوری ممالک کی صف میں شامل ہو چکے ہیں ——

اس کے باوجود ہماری حالت روز بروز خراب سے خراب تر ہوتی جا رہی ہے، جس شجرِ جمہوریت سے لوگ لذیذ پھل کھاتے ہیں اسی درخت سے ہمیں ذلّت اور بدنصیبی کے پھل مل رہے ہیں۔

سوال کیا جاتا ہے کہ ایسا کیوں ہے —— ؟

اس کا جواب صرف ایک فقرے میں دیا جا سکتا ہے:

ہم جمہوریت کے آئین پر عمل نہیں کرتے —— ہم نے صرف جمہوریت کا لیبل لگا رکھا ہے۔

آخر یہ سوال صرف جمہوریت کے بارے میں ہی کیوں صحیح ہے، اسلام کے بارے میں کیوں صحیح نہیں ہو سکتا؟ لوگوں کی اس مخالفانہ روش کا ذمّہ دار جمہوریت کو تو قرار نہیں دیا جاتا —— لیکن جب اسلام کے بارے میں لوگوں کی مخالفانہ روش کی بات آتی ہے تو ذمّہ دار اسلام کو قرار دیا جاتا ہے ——

یہ ایسا سوال ہے کہ جس کا جواب شاید دوسرے تو رکھتے ہوں لیکن ہمارے

پاس اس سوال کا جواب نہیں ہے ۔

تیسرا نکتہ یہ ہے کہ ـــــــــ

اگر مان لیا جائے کہ مدنیت کی ترقی کی وجہ سے اسلام نے اجتماعی زندگی میں اپنا مقام کھو دیا ہے تو جمہوریت کے ساتھ یہی صورت حال کیوں پیش آئی ؟

حالانکہ یہی سنہرا دَور جمہوریت کا سنہری دور کہلاتا ہے ـــــــ

اس دور میں جمہوریت کو عالمی مقبولیت حاصل ہوئی ، مگر پہلی جنگِ عالمگیر کے فوراً بعد اقوامِ عالم کی ایک خاصی تعداد نے جمہوریت سے منہ موڑ لیا ـــــــ

اور کمیونسٹ نظام کو قبول کر لیا ـــــــــ اور جمہوریت کے نظام ہر روز کسی نہ کسی مورچے کو چھوڑ کر پسپا ہونے لگے ۔

اور تھوڑے ہی عرصے بعد ـــــــــــ

معاملہ اس حد تک پہنچ گیا کہ اس کرۂ ارض کی نصف آبادی کمیونسٹ نظام کے تحت آگئی ۔

کیا کمیونسٹ نظام، جمہوری نظام کے ارتقاء و تکمیل کا ایک مرحلہ ہے جیساکہ جمہوریت کو پچھلے نظاموں کے ارتقاء کا ایک مرحلہ کہا جاتا ہے ـــ ؟

یا جمہوریت کا مرحلہ ہی خود اس کی تکمیل کا مرحلہ ہے ـــــ ؟

یہ وہ مسائل اور سوالات ہیں جن کے جواب کے لیے ایک دقیق اور وسیع بحث کی ضرورت ہے جبکہ اس مقالہ میں اس کے لیے گنجائش نہیں ۔ البتہ جو کچھ مختصراً کہا جا سکتا ہے وہ یہ ہے ـــــــ

پہلا نکتہ :

جب ہم حقیقت بین نگاہوں کے ساتھ اس جمہوریت کا گہرا مطالعہ کرتے ہیں جو اس وقت دنیا کی متمدن اقوام کے ہاتھوں میں ہے تو ہم پر جلد ہی یہ بات واضح

ہو جاتی ہے کہ ماضی میں جو ظالمانہ استبدادانہ اور اخلاقی انحطاط کا طرزِ عمل ایک صاحبِ اقتدار فرد اختیار کرتا تھا ـــــــ

اب اسی طرزِ عمل کو ـــــــ

اجتماعی شکل دی گئی ہے ـــــ اور ـــــ اسے نام نہاد ترقی کا نام دیا گیا ہے ۔

ماضی میں وقت کے سکندر اور چنگیز جو مظالم اور شرمناک کام اپنی طاقت کے بل بوتے پر انجام دیتے تھے اور کمزوروں کو اپنے جس ظلم و ستم کا نشانہ بناتے تھے ـــــــ آج طاقتور جمہوری اور متمدن معاشرے اجتماعی طور پر کمزور قوموں کو اسی ظلم و ستم کا نشانہ بنائے ہوئے ہیں ـــــــ

فرق صرف یہ ہے کہ ـــــــ

ماضی میں یہ سارے مظالم اور زیادتیاں، جہالت کی بنا پر بے پردہ اور علانیہ کی جاتی تھیں اور نتیجتہً مظلوموں کے اندر جلد ہی انتقام کا جذبہ بیدار کر دیتی تھیں ـــــــ

اور وہ ظالمانہ نظام کے خلاف اُٹھ کھڑے ہوتے تھے ۔ ـــــــ

اور اس کا تختہ الٹنے کے لیے ـــــــ

ایک مؤثر کردار ادا کرتے تھے ـــــــ

لیکن آج ساری زیادتیاں اور مظالم فنّی اور نفسیاتی اصولوں کے ساتھ بڑی مہارت سے حق و انصاف اور انسان دوستی کے پردوں میں کیے جاتے ہیں ۔

اور ہر روز کوئی نہ کوئی پردہ چاک ہو کر ـــــــ

ظلم اور ظلم کرنے والوں کے چہروں کو بے نقاب کرتا رہتا ہے ۔

جمہوریت کا نام رکھ کر اور جمہوریت کے پردے میں استعماریت ، غاصبانہ قبضوں

اجارہ داریوں اور امداد کے نام پر منافع میں حصہ داریوں کا کھیل اور ایسے ہی دوسرے کھیل اسی ظالمانہ انداز میں کھیلے جا رہے ہیں۔

عہدِ استعمار کے عبرت انگیز مناظر کو آج بھی مشرقی ممالک کے ہر گوشے اور حصے میں دیکھا جا سکتا ہے اور یہ جمہوریت کی روشن یادگاریں ہیں۔

آج بھی استعماری مظالم کا زندہ ثبوت ———

الجزائر ——— کانگو ——— اور ——— کوریا ہیں۔

فرانس جو اقوامِ عالم کی عدالت میں آزادی کا مشعل بردار بنا ہوا ہے اس کی آج بھی یہ منطق ہے کہ الجزائر، فرانس کا ایک حصہ[1] ہے۔

اور الجزائر کے مظلوموں کی فریاد کا جواب دنیا کی بڑی طاقتوں کے پاس اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ ———

یہ فرانس کا داخلی معاملہ ہے۔ اس میں دوسروں کو مداخلت کا اختیار حاصل نہیں وغیرہ وغیرہ۔

اس ڈیموکریسی کے ہاتھوں جو کچھ دنیا پر گزری اسے ان چند فقروں میں بیان کیا جا سکتا ہے:

ڈیموکریسی کے طریقے نے دنیا کو ———

دو مختلف طبقوں میں تقسیم کر دیا ——— ایک طبقہ ان بڑی طاقتوں کا ہے جو ترقی کا پیش رو اور باقی اقوامِ دنیا کی گردنوں کا مالک بن گیا۔ ان کی جان و مال اور آبرو اس طرح اس کے قبضۂ قدرت میں چلی گئیں کہ وہ ان کے ساتھ جو چاہے سلوک کر سکتا ہے۔

---

[1] یہ مقالہ الجزائر کی آزادی سے پہلے لکھا گیا ہے

دوسرا طبقہ ان پسماندہ جمہوری قوموں کا ہے ———

جو اپنے آقاؤں کے ———

ایسے غلام بن گئے ہیں کہ وہ جمہوریت کے لباس میں، شرمناک ترین، استبدادی طریقوں کو عمل میں لاتے ہیں اور اپنے نام نہاد آزادی بخش اور عوام پسند قوانین کے پردے میں ———

اپنے آقاؤں کی خواہشات پوری کرتے ہیں ———

جس نظام اور طریقے کی یہ حقیقت و نوعیت ہو اور جو روحانیت اور اخلاق کو اس بہانے سے کہ ان کو نافذ کرنے والی کوئی قوتِ نافذہ نہیں ہے راستے سے ہٹا دیتا ہے ———

کیا اسے انسانیت کی تکمیل کا طریقہ کہا جا سکتا ہے ——— ؟

ہم نے جن حقائق اور نتائج کا ذکر کیا ہے ان کی روشنی میں اگر دیکھا جائے تو کمیونسٹ نظام بھی ڈیموکریسی سے کچھ پیچھے نہیں ہے ———

اگرچہ کہ دونوں کے طرزِ جہانگیری میں مسلک کا فرق ہے۔

کمیونسٹ نظام سے ارتقاء کو نسبت دینا بھی بڑا عجیب ہے کیونکہ ابتدائی مراحل کو طے کیے بغیر ارتقاء کی بات کرنا بالکل بے معنی ہے۔

دنیا کا پسماندہ طبقہ حتیٰ کہ وہ جاہل قومیں جنھوں نے مدنیت اور جمہوریت کی بو تک نہیں سونگھی ہے وہ سب سے زیادہ جوش کے ساتھ اور سب سے زیادہ عجلت کے ساتھ کمیونسٹ نظام کی طرف لپکتی ہیں۔

کیا یہ ایک انقلابی کایا پلٹ کا نتیجہ ہے ——— ؟

جدلی مادیت کا فلسفہ جس انقلابی جست کا ذکر کرتا ہے وہ اس پر منطبق نہیں ہوتی۔

اگر آپ انصاف کی نظر سے دیکھیں تو آپ پر یہ بات بخوبی واضح ہو جائے گی کہ جو معترضین اور نافذین ڈیمو کریسی کا ہتھیار لے کر اسلام پر حملہ آور ہوتے ہیں وہ یورپ کی آزادی سے اخلاقی انحطاط ،

عیاشی اور شہوت رانی ــــــــــ

لینا چاہتے ہیں وہ مفاسد کی اصلاح ، امن عامہ اور فلاحِ عامہ کے خواہشمند نہیں ہیں ۔

یہی وجہ ہے کہ ــــــــــ

ہم یورپ کی اخلاقی برائیوں کو بہت ہی کم وقت میں اپنا لیتے ہیں اور بڑی آسانی سے انھیں سیکھ کر اختیار کر لیتے ہیں ۔

جبکہ قانون کی کسی ایک دفعہ کو نافذ کرنے کے لیے ہم آمادہ نہیں ہوتے حالانکہ ملک و ملّت کی بھلائی اس کے نافذ کرنے میں مضمر ہوتی ہے ۔

مغرب میں جو چیز عنقا ہے وہ ہمارے اندر نایاب تر ہے ۔

اسی طرح جو لوگ کمیونزم کا پتھر اپنے سینے پر دے مارنے کے لیے آمادہ ہو جاتے ہیں وہ محرومیت کے شکار لوگ ہیں جو اچھی طرح سمجھے بغیر اس طریقِ زندگی کو اختیار کرنا چاہتے ہیں ۔ وہ دولت مند طبقے سے صرف انتقام لینے کی آرزو رکھتے ہیں ۔

اور جس ذلت اور محرومی کا مزا ــــــــــ

وہ خود چکھتے رہے ہیں وہ اسے ان دولت مندوں کو بھی چکھانا چاہتے ہیں ۔

اور انھیں بھی اسی حالت سے دوچار کرنا چاہتے ہیں جس سے وہ خود دوچار رہے ہیں ۔

اس کے بعد خود ان کے ساتھ جو کچھ پیش آئے گا اس سے انھیں کوئی سروکار نہیں ہوتا ۔

ظاہر ہے اس طرح کی تبدیلیوں کو ــــــــــ

ــــــــــ کسی بھی منطق کی رو سے انسانیت کی اجتماعی اور تمدنی ترقی کا نام نہیں

دیا جا سکتا ۔

ایک شخص کا استبداد جس کا تعلق ماضی سے ہے اور ایک معاشرہ اور قوم کا استبداد جس کا تعلق آج کی بڑی طاقتوں سے ہے ان دونوں کے لیے تدریجی ارتقا و تکمیل کے لیے جو بات فرض کی جا سکتی ہے وہ یہ ہے کہ ــــــــــ

انسانیت نے اپنا سفر ــــــــــ

مادیت اور روحانیت کی دو جہتوں کے ساتھ طے کیا ہے اور وہ ان دونوں کے ساتھ پروان چڑھی ہے ۔ اس لیے یہ کہنا درست ہو گا کہ بالآخر حق کی منطق ہی ہر دوسری منطق کی جگہ لے لے گی اور یہی اسلام کا طریقہ ہے ۔

" اِنَّ الْاَرْضَ لِلّٰهِ ۙ يُوْرِثُهَا مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ ۗ وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِيْنَ "

" زمین اللہ کی ہے ، اپنے بندوں میں سے جس کو چاہتا ہے اس کا وارث بنا دیتا ہے اور آخری کامیابی انھی کے لیے ہے جو اس سے ڈرتے ہوئے کام کریں ۔"

(سورہ اعراف آیت ۱۲۸)

جیسا کہ ہم کہہ چکے ہیں اس موضوع کا دامن بہت وسیع ہے اور ہم اس خیال سے کہ کہیں اصل مضمون و مدعا سے دور نہ ہو جائیں بس اسی پر قناعت کرتے ہیں ع

" تو خود حدیث مفصل بخواں ازیں مجمل "

تیسرا نکتہ :

جیسا کہ یہ بات واضح ہو چکی ہے کہ اسلامی معاشرہ میں مقام ولایت سے جو احکام و قوانین جاری کیے جاتے ہیں وہ بالعموم قابلِ تغیر ہوتے ہیں اور ان کا باقی رہنا اور منسوخ ہو جانا مصلحت کے تابع ہوتا ہے ۔ اسی وجہ سے انھیں شریعت کا نام

نہیں دیا جاتا لیکن خود ولایت وحکومت کے مسئلہ کی نوعیت اس طرح کی نہیں ہے ۔

ولایت کا مسئلہ ایک ایسا مسئلہ ہے ——————

جس سے کوئی بھی معاشرہ کسی بھی حالت میں بے نیاز نہیں ہو سکتا ۔

معاشرہ خواہ کتنا ہی چھوٹا کیوں نہ ہو اُسے ایک حکومت کی ضرورت ہوتی ہے ۔ ایک عام آدمی بھی اپنی معمولی سمجھ بوجھ کے ساتھ معاشرہ کی اس ضرورت کو اچھی طرح محسوس کرتا اور سمجھتا ہے ——————

ولایت وحکومت کے قیام کا امر ایک مسلمہ امر ہے ۔ یہ امر ناقابلِ تغیر اور فطری ہے ۔ دنیا کا خواہ کوئی اجتماعی نظام ہو ،

چاہے استبدادی ہو یا دستوری و آئینی ——— جاہل وپسماندہ ہو یا ترقی یافتہ ، ——— بڑا ہو یا چھوٹا ——— حتّٰی کہ ایک خاندان بھی اپنے نظم ونسق کو برقرار رکھنے کے لیے ایک حکومت اور ولایت کا محتاج ہوتا ہے ۔

اسلام جس نے اپنی بنیاد فطرت پر رکھی ہے ، خدا کی عطا کردہ انسانی فطرت ہی کو اپنے تمام اصولی اور کلّی احکام کا مرجع قرار دیتا ہے ۔ اسلام نے فطرت کے بنیادی احکام کو کبھی بھی منسوخ نہیں کیا ہے ———

پھر وہ ولایت کے مسئلے سے کس طرح بے توجہی اختیار کر سکتا ہے جس کی ضرورت و اہمیت کو ایک کم عمر بچہ تک اچھی طرح سمجھتا ہے ۔

انسان کی اجتماعی زندگی کو ہمیشہ ایک سرپرست اور منتظم طاقت کی ضرورت ہوتی ہے اس لیے ولایت کا مسئلہ مسلّمہ فطری مسائل میں سے ایک ہے ۔ ہم وہ آیاتِ قرآنی نقل کر چکے ہیں جن میں فطرت کو دین کی بنیاد قرار دیا گیا ہے ———

یہ آیاتِ قرآنی اس بات کو ثابت کرنے کے لیے کافی ہیں کہ ولایت وحکومت کا مسئلہ ایک ثابت شدہ دینی مسئلہ ہے اور یہ شریعت کے مسائل میں سے ایک ہے ۔

مزید یہ کہ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنی حیاتِ مبارکہ میں اسلامی معاشرہ کے خود سرپرست و سربراہ تھے اور مسلمانوں کی زندگی کے تمام شعبوں کے لیے آپ منتظم اور سرپرست مقرر فرماتے رہے تھے ۔

——— دوسرے شعبوں میں آپ گورنروں کو مقرر فرماتے ۔

——— مقدمات کے تصفیے کے لیے قاضیوں کو متعین فرماتے

——— دین کی نشر واشاعت کے لیے مبلغین کو روانہ فرماتے ———

——— اور ——— تعلیم وتربیت کے لیے معلمین کو بھیجتے ———

——— بیت المال کے لیے رقوم جمع کرنے کا کام منتخب عمال کے سپرد فرماتے ۔

جنگ کے امور انجام دینے کے لیے امرار کا انتخاب فرماتے ———

حتّٰی کہ جب آپ خود کسی جنگ میں شرکت کے لیے مدینہ منورہ سے باہر تشریف لے جاتے تو اپنی جگہ ولایت و سرپرستی کے لیے کسی دوسرے کو جانشین بنا جاتے ۔

یہ وہ باتیں ہیں جو تاریخی حیثیت سے پایۂ ثبوت کو پہنچ چکی ہیں ———

رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اس طرزِ عمل کے بعد کس طرح ولایت کے مسئلے کا انکار کیا جا سکتا ہے ۔ نصِ قرآنی کے مطابق اور خود رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے ارشادات ومعتقدات کے مطابق ———

اسلام ایک عالمگیر دین اور نظامِ زندگی ہے ———

اور یہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ہے ———

اور یہ ہزاروں اجتماعی پہلو رکھتا ہے اور اسے اپنے نفاذ وقیام کے لیے ولایت وحکومت درکار ہے ۔ ایک ایسا دین آخر کس طرح مسئلۂ ولایت کے بیان کرنے سے پہلو تہی کر سکتا ہے ——— ؟

کیا وہ دین جو زندگی کے عام امور جیسے اکل وشرب کے بارے میں

احکام دیتا ہے اور انسان کے ان کاموں کے بارے میں جنھیں وہ اپنی طبیعت و جبلت کی بنا پر انجام دیتا ہے ان کی کامل تشریح کرتے ہوئے ان کے بارے میں سینکڑوں احکام و ہدایات دیتا ہے۔

کیا وہ جب ولایت کا مسئلہ سامنے آئے گا (جو اجتماعی زندگی کی روح ہے) تو اس کے بیان کرنے سے اپنا منہ بند کرے گا۔

مسئلہ ولایت کے ثابت کرنے کے لیے ——————

قرآن مجید میں بہت سی آیات آئی ہیں جن میں سے چند یہ ہیں:

"اَلنَّبِیُّ اَوْلٰی بِالْمُؤْمِنِیْنَ مِنْ اَنْفُسِهِمْ"

(سورۂ احزاب آیت ٦)

"اِنَّمَا وَلِیُّكُمُ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوا الَّذِیْنَ یُقِیْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَیُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَهُمْ رٰكِعُوْنَ۔"

(سورۂ مائدہ آیت ۵۵)

"اَطِیْعُوا اللّٰهَ وَاَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِی الْاَمْرِ مِنْكُمْ"

(سورہ نسار آیت ۵۹)

"وَالْمُؤْمِنُوْنَ وَالْمُؤْمِنٰتُ بَعْضُهُمْ اَوْلِیَآءُ بَعْضٍ یَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَیَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ" (توبہ ۹/۷۱)

اس طرح کی اور دوسری آیات بھی ہیں۔ البتہ ایک گروہ نے ان آیات میں ولایت کے معنی دوستی یا یاری کے لیے ہیں، لیکن انھوں نے اس لفظ کے اصل مادہ کے حقیقی معنی کو ترک کرنے کے سوا اور کچھ نہیں کیا ہے۔

چوتھا نکتہ:

گزشتہ بحث کا حاصل یہ ہے کہ مسئلہ ولایت ایک شرعی مسئلہ ہے اور یہ دوسرے سارے شرعی اور دینی مسائل کی طرح اسلامی معاشرہ میں ہمیشہ زندہ رہے گا۔

مقام ولایت کی حفاظت کرنے والے ——————

اور اس کے ذمہ دار عام مسلمان ہیں —————— جبکہ اس منصب پر ایک یا کئی افراد فائز رہتے ہیں۔

اب ہمیں یہ دیکھنا چاہیئے کہ کیا اس مقام پر فائز رہنے کے لیے اسلام نے کچھ افراد کا تعین کیا ہے یا اسلام نے اس بارے میں خاموشی اختیار کی ہے۔؟

اور اس کے نتیجے میں مسلم معاشرہ کو ——————

کیا یہ اختیار حاصل ہو گیا ہے کہ وہ جس طرح بھی چاہے اجتماعی دینی زندگی کے پہیے کو گھماتا رہے ——————؟

حالانکہ شریعتِ اسلامی نے زندگی کے خاص شعبوں کی سرپرستی و سربراہی کے لیے چند معین اشخاص کے بارے میں بتایا ہے کہ وہ کون ہیں ——————

اس بارے میں کسی کو کوئی اختلاف نہیں ہے۔ جیسے چھوٹے بچوں کی ولایت و سرپرستی باپ کو حاصل ہے —————— اور —————— امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے بارے میں عام مسلمانوں کو ایک دوسرے کی ولایت حاصل ہے ——————

اہلِ تشیّع کا عقیدہ یہ ہے کہ ——————

رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے امیر المومنین علی بن ابی طالب علیہ السّلام کو

اس مقامِ ولایت کے لیے منتخب فرمایا تھا اور آپؑ کے بعد آپؑ کی اولادِ کرام میں سے گیارہ ایک کے بعد دوسرے اس مقام پر فائز ہوتے رہے ہیں ۔

اہلِ سنّت اس عقیدے کو نہیں مانتے ۔

اہلِ تشیّع نے ان کے مقابل اس عقیدے کے ثبوت کے لیے عقلی دلائل کے علاوہ بہت سی آیات اور ان احادیثِ متواترہ سے استدلال کیا ہے ——

جو شیعہ اور سنّی دونوں سلسلوں میں ——

بیان کی گئی ہیں ——

لیکن ان سے تعرّض کرنا ہماری اس بحث کے دائرے سے باہر ہے ۔

اس مقام پر یہ یاد دلانا ضروری ہے کہ ——

شیعہ جو ایک خاص عقیدہ رکھتے ہیں اس کا یہ نتیجہ نہیں ہے کہ غَیبتِ امامؑ کی صورت میں، اس جیسے دور میں جس میں ہم زندگی بسر کر رہے ہیں اسلامی معاشرہ بغیر سرپرست کے رہ جائے اور اس گلّے کی طرح منتشر ہو جائے جس کا کوئی چرواہا نہ ہو اور پراگندگی کے عالم میں زندگی بسر کرے۔

ہمارے پاس مقامِ رہبریت کے اصول کو ثابت کرنے کے بھی دلائل ہیں اور اس مقام پر کن اشخاص کو متعین ہونا چاہیے اس کے بھی دلائل ہمارے پاس ہیں

البتہ شخصیت مقام سے الگ ہے ——

کسی شخصیت کے نہ ہونے یا چلے جانے سے وہ مقام یا منصب ختم نہیں ہو جاتا ——

آخر کس طرح اس بات کا تصور کیا جا سکتا ہے کہ ——

کبھی یہ مقام و منصب مختلف اسباب و علل کی بنا پر منسوخ ہو جائے گا اور اس کا وجود ہی باقی نہ رہے گا۔

حالانکہ ولایت و رہبری کا یہ مقام اسلامی فطری اساس کی بنا پر ثابت ہو چکا ہے اور اس کا منسوخ ہونا فطرت کا منسوخ ہونا ہے اور فطرت کا منسوخ ہونا اسلام کے منسوخ ہونے کے برابر ہے ۔

مزید یہ کہ بہت سے احکام کا تعلق حدود و تعزیرات اور اموال سے ہے جو اسلامی شریعت میں موجود ہیں ۔

اور ان احکام کی ابدیت اور دوام ——

کتاب و سنّت سے ثابت ہے ——

یہ ولایت کا مقام و منصب ہی ہے جو ان احکام کو نافذ کرتا ہے ۔ اس طرح ولایت کا مسئلہ ہر حال میں زندہ رہے گا ——،

خواہ امام غائب ہو یا وہ حاضر و موجود ہو ——!

پانچواں نکتہ :

کیا ولایت تمام مسلمانوں کے لیے ہے ——،

یا عادل مسلمانوں کے لیے —— یا (آج کی اصطلاح میں) فقیہ سے متعلق ہے ——

اسلام کے دورِ اوّل میں فقیہ کا اطلاق اس شخص پر ہوتا تھا جو تمام علومِ دینی ، اصول و فروع کا عالم ہو اور اخلاق سے بھی آراستہ ہو نہ کہ وہ صرف مسائل کا جاننے والا ہو جیسا کہ آج کل سمجھا جاتا ہے ۔

تیسری صورت میں کیا ولایت ہر فقیہ سے متعلق ہے کہ فقہا کی زیادہ تعداد اور کثرت کی صورت میں ان میں سے جو بھی اقتدار حاصل کرے اس کا حکم نافذ ہو اور اس سے سرتابی نہ کی جا سکے یا پھر یہ کہ ولایت اس فقیہ سے متعلق ہے جو سب سے زیادہ عالم ہو۔

یہ ایسے مسائل ہیں جنھیں حل کرنے کی اس مقالے میں گنجائش نہیں ہے۔
یہ مسائل فقہ کے اندر حل ہونے چاہئیں۔

اس بحث سے جو نتیجہ حاصل کیا جا سکتا ہے وہ یہ ہے کہ ——

حکمِ فطرت کی رو سے مقامِ ولایت کا وجود لازمی قرار پاتا ہے اور فطرت کا یہ حکم معاشرہ کے اعلیٰ مصالح کے تحفظ پر مبنی ہے ——

اسلام بھی فطرت کے قدم بقدم چلتا ہے ——

ان دونوں مقدمات کا یہ نتیجہ برآمد ہوتا ہے کہ جو شخص بھی تقویٰ، حسنِ تدبیر، حالات سے باخبری میں سب سے بہتر ہو اسی کو اس مقام پر فائز ہونا چاہیے
اس بات سے کسی کو اختلاف نہیں ہو سکتا کہ حکومت کے اولیا (رہبر و سرپرست) معاشرہ کے بہترین اور اپنی خوبیوں کی بنا پر منتخب ترین افراد ہونے چاہئیں۔

اب یہ بات قابلِ غور ہے کہ اس وقت ——

اسلامی معاشرہ نے جو وسعت پیدا کر لی ہے اور وہ جس طرح مختلف منطقوں اور مختلف ملتوں اور قوموں میں پھیلا ہوا ہے ——

تو کیا اس صورت میں اسے ایک ہی ولایت اور حکومت کے ماتحت ہونا چاہیے —— یا منطقوں اور ملکوں کے اس اختلاف کے ساتھ ——

اس کے اندر مختلف حکومتیں تشکیل پانی چاہئیں ——

یا پھر مسلمانوں کی اتحاد و اشتراک رکھنے والی ایسی حکومتیں ہونی چاہئیں جو ایک مرکزی حکومت کے زیرِ نگرانی ہوں ——

یا وہ اقوامِ متحدہ کی طرح کوئی ادارہ تشکیل دیں ؟

یہ سب ایسی تجویزیں ہیں کہ اسلامی شریعت میں ان میں سے کسی ایک کے بارے میں کوئی جامع حکم نہیں دیا گیا ہے اور فی الواقع ایسا کوئی حکم ہونا بھی نہیں چاہیے۔

کیونکہ شریعت میں دین کی اصولی اور بنیادی باتیں شامل ہوتی ہیں اور طرزِ حکومت تمدن کی ترقی کے ساتھ اور معاشروں میں پیدا ہونے والے تغیرات کے ساتھ بدلتا رہتا ہے ——

اس بنا پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ ——

خواہ کوئی زمانہ ہو، اسلامی حکومتوں کا طریقہ اسلامی شریعت کے تین مستقل اصولوں کی بنیاد پر استوار ہونا چاہیے۔

(۱) —— مسلمانوں کو چاہیے کہ وہ آخری ممکنہ حد تک اتحاد و اتفاق کے لیے کوشاں رہیں۔

(۲) —— اسلام اور مسلمانوں کے مصالح کی حفاظت سب پر واجب ہے۔

(۳) —— جامعہ اسلامی کی سرحدیں اعتقادی و نظریاتی ہیں نہ کہ طبیعی، روایتی یا معاہداتی۔

اس سلسلے کی سب سے اہم بات یہ ہے کہ ——

مقامِ ولایت اور حکومتِ اسلامی ——

خواہ وہ کسی شکل میں مسلمانوں کے امور کا انتظام و انصرام کرے وہ ایک بنیادی مسئلے سے غفلت نہیں برت سکتی ——

اور وہ مسئلہ یہ ہے کہ ——

اسلامی معاشرہ میں رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سیرت و سنت کو جاری کیا جائے اور آپ کی چند سالہ زندگی میں ولایت و رہبری کا جو نمونہ ہمیں ملتا ہے اسی کی پیروی کی جائے۔

جیسا کہ ہم کہہ چکے ہیں اسلامی معاشرہ میں ولایت کا مسئلہ ثابت شدہ

اور مسلّمہ ہے اور اسی لیے وہ شریعت کا ایک جزء ہے ۔ اس کی اصولی اور بنیادی حیثیت کے ثبوت کے لیے حکمِ خداوندی درکار ہے ______

اسی لیے اللہ تعالیٰ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سیرت کو آیاتِ قرآنی میں پسندیدہ اسوہ قرار دیا ہے اور مسلمانوں کو اس کے سوا کوئی حکم نہیں دیا ہے کہ وہ بس رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اتباع اور پیروی کریں۔

جیسا کہ ارشادِ خداوندی ہے :

" لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللَّهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ " (سورۂ احزاب آیت ۲۱)

قابلِ اعتبار اسناد سے خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا یہ ارشاد ملتا ہے :

" من رغب عن سنتی فلیس منی "

اس مضمون پر مشتمل اہلِ بیتؑ کی بھی بہت سی روایات موجود ہیں ۔

رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سیرت کو وضاحت سے بیان کرنا اور اس کی خصوصیات کی تشریح کرنا ایک جداگانہ بحث کا متقاضی ہے ۔ جو کچھ یہاں اختصار کے ساتھ کہا جا سکتا ہے وہ یہ ہے :

پہلی بات تو یہ ہے کہ اسلام میں تقویٰ کے سوا کوئی امتیاز نہیں ہے ، اسلام کی رو سے تمام طبقاتی امتیازات منسوخ قرار پاتے ہیں ۔

معاشرہ کے مختلف طبقات جیسے راجہ اور رعایا ، آقا اور خادم ، مالک اور مزدور ، مرد اور عورت سب کو تحفظ حاصل ہے ۔ سب حقوق میں مساوی ہیں ۔ صرف خدا ہی کی وہ باعظمت ذات ہے کہ اس کی کبریائی کے آگے سب کو سرِ تسلیم خم کرنا چاہیے ۔

" قُلْ يَا أَهْلَ الْكِتَابِ تَعَالَوْا إِلَىٰ كَلِمَةٍ سَوَاءٍ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ أَلَّا نَعْبُدَ إِلَّا اللَّهَ وَلَا نُشْرِكَ بِهِ شَيْئًا وَلَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا أَرْبَابًا مِنْ دُونِ اللَّهِ ۚ فَإِنْ تَوَلَّوْا فَقُولُوا اشْهَدُوا بِأَنَّا مُسْلِمُونَ "

(سورہ آلِ عمران آیت ۶۴)

" يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنَّا خَلَقْنَاكُمْ مِنْ ذَكَرٍ وَأُنْثَىٰ وَجَعَلْنَاكُمْ شُعُوبًا وَقَبَائِلَ لِتَعَارَفُوا ۚ إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللَّهِ أَتْقَاكُمْ "

(سورہ حجرات آیت ۱۳)

دوسری بات یہ ہے کہ تمام لوگ قانون کی نظر میں کامل مساوات رکھتے ہیں اور قوانین کے اجراء میں ذرا بھی کوئی استثنیٰ نہیں ۔

" لَيْسَ بِأَمَانِيِّكُمْ وَلَا أَمَانِيِّ أَهْلِ الْكِتَابِ ۗ مَنْ يَعْمَلْ سُوءًا يُجْزَ بِهِ "

(سورۂ نساء آیت ۱۲۳)

تیسری بات یہ ہے کہ ______

مقامِ ولایت سے جو احکام صادر ہوتے ہیں وہ شوریٰ کے ذریعہ اور اسلام و مسلمانوں کے مصالح کی بنیاد پر صادر ہوں گے ۔

"وَشَاوِرْهُمْ فِی الْاَمْرِ ۚ فَاِذَا عَزَمْتَ فَتَوَکَّلْ عَلَی اللّٰہِ ؕ"

(سورۂ آل عمران آیت ۱۵۹)

یہ بات ظاہر ہے کہ یہ مقدّس نمونہ، ایک ایسا نمونہ اور ایک ایسا طریقہ ہے جو کسی بھی انسانی معاشرہ کے مصالح کے خلاف نہیں اس لیے وہ قابلِ ترمیم و تغیّر نہیں ہے وہ فطرت کے ان مسلّم و ثابت احکام میں سے ہے جن کی اسلام توثیق کرتا ہے۔

پھر یہ نمونہ اور طریقہ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ و آلہٖ وسلم کے طرزِ عمل کی تمام تفصیلات اور جزئیات کے ذریعہ میسّر آیا ہے اور تمام حالات اور مواقع پر آنحضرت؊ کا طریقہ اور سنّتیں ہی قابلِ اتباع ہیں۔

۲

محمّد صلی اللہ علیہ و آلہٖ وسلّم اسلام کے آئینے میں

آج سے چودہ سو سال[1] پہلے محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو نبوت و رسالت کے عظیم منصب پر فائز کیا گیا تھا اور خدائے بزرگ و برتر نے دنیا کے تمام انسانوں کی رہنمائی اور رہبری کی بھاری ذمہ داری آپ کے سپرد کی تھی۔ آپ پر مقدس آسمانی کتاب قرآن مجید کا نزول ہوا جو خدائے واحد کا کلام اور اسلام کی علمی و عملی تعلیمات اور اصولوں کا مجموعہ اور رسولِ اکرمؐ کا قیامت تک باقی رہنے والا معجزہ ہے جسے آپ کے کروڑوں اور اربوں پیروؤں کی زندگی کے لائحۂ عمل کی حیثیت حاصل ہے اور جو آج ساری انسانیت کی توجہ کا مرکز بن چکا ہے۔ اس کو انقلابِ بشریت اور کمالِ بشریت کے اہم ترین عوامل میں سے ایک عامل تسلیم کیا جانا چاہیے۔ بلکہ یہ ایک ایسا اہم ترین عامل بن چکا ہے جو گزشتہ چودہ صدیوں سے اربوں انسانوں کے اعتقاد و عمل پر اثر انداز ہو کر ان کی اجتماعی زندگی کے ہر گوشے پر بہترین اثرات مرتب کرتا رہا ہے۔

---

[1] یہ مقالہ ۱۳۸۸ھ مطابق ۱۳۴۷ شمسی میں لکھا گیا۔

اسلام اور دوسرے مذاہب

یہ بات درست ہے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی لائی ہوئی شریعت اور مذہب، برہمائی بُت پرستی سے جو تیس ۳۰ صدی یا اس سے زیادہ پرانا ہے اور بدھ مذہب سے، جو پچیس ۲۵ صدی یا اس سے زیادہ قدیم ہے اور عیسائی مذہب سے جس نے اپنی زندگی کی بیس ۲۰ صدیاں پوری کر لی ہیں، جوان اور کم عمر ہے اور اس میں کوئی شک نہیں کہ اس مذہب کے ماننے والے اسلام کو ماننے والوں سے زیادہ ہیں۔ لیکن جب ہم ہندوؤں کی مقدس کتاب وید اور دوسری مذہبی کتابوں کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہم پر یہ بات بخوبی واضح ہو جاتی ہے کہ ان کے تمام یا اکثر مذہبی طریقے اور مذہبی تعلیمات منفی نوعیت کی اور غیر مثبت ہیں۔ نیز یہ کہ ایک چھوٹی سی اقلیت کے سوا ان مذاہب کے اکثر ماننے والے اپنے مذہب کی تعلیمات سے ناواقف ہیں اور وہ اپنی کتاب مقدس سے کوئی استفادہ نہیں کر پاتے۔

حقیقت یہ ہے کہ ہندو معاشرہ اپنے عمل اور ردّ عمل کے اعتبار سے ایک مخصوص دائرہ کے اندر محدود ہے اور اپنے اس دائرے سے باہر اُس کا کوئی اثر نہیں ہے۔

اسی طرح بدھ مذہب بھی اپنی منفی قسم کی تعلیمات میں ہندو مذہب سے کچھ کم نہیں ہے اور یہی حال عیسائیت کا ہے اور یہ بات چاروں انجیلوں اور ان کے اصل نسخوں سے بخوبی ظاہر ہوتی ہے۔

عیسائیت عملی شریعتوں اور اجتماعی قوانین کی بالکلیہ نفی کرتی ہے اور فلسفہ و عقل سے پوری طرح بدظن رہی ہے۔ اصولاً حضرت مسیح کے صلیب پر چڑھ کر اپنی جان کی قربانی دینے کی داستان اور انسانیت کے تمام گناہوں یا خصوصاً پیروانِ مسیح

کے تمام گناہوں کی بخشش کا عقیدہ مثبت مذہبی تعلیمات سے کوئی ہم آہنگی اور مطابقت نہیں رکھتا۔

دوسرے مذاہب جیسے صابئیت اور رمانویت اپنے اثر و رسوخ سے پوری طرح محروم ہو چکے ہیں۔ یہودیت جیسے مذاہب ایک نسلی طبقے تک محدود ہو کر اپنے پیروؤں کی اقلیت کو کبھی بھی اکثریت میں تبدیل نہیں کر سکے۔

یہ صرف دین اسلام کا مقدس آیئن اور طریقہ ہے جس نے اپنے عقلی اور واضح عقائد اور مثبت انفرادی و اجتماعی قوانین کی بنا پر کروڑوں انسانوں کے دلوں میں اپنے لیے جگہ بنا لی ہے اور ان کی نگاہوں میں اسے بڑی عظمت اور تقدّس حاصل ہوا ہے اور ہر دور میں ہمیشہ کروڑوں انسان اس دین سے وابستہ رہے ہیں اور اپنی پوری زندگی اس کے اصولوں کے مطابق گزارتے آئے ہیں۔

یہ بات ظاہر ہے کہ جب کسی ایک فرد کی مثبت اصولوں پر استوار منظّم زندگی، ہزاروں افراد پر براہ راست یا بالواسطہ طور پر اثر انداز ہو سکتی ہے تو اندازہ کیجیے کہ ایک وسیع منظّم معاشرہ انسانیت پر کس قدر اور کیسے زبردست اثرات مرتب کرے گا۔

اسلام کی یہی وہ خصوصیت ہے کہ اس مقدس آیئن کے مخالفین اس کے خلاف اپنی مکّارانہ سیاست کے استعمال کرنے سے کبھی غافل نہیں رہے ہیں اور اس نور کو بجھانے کے لیے انھوں نے کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کیا ہے[1]۔

یُرِیْدُوْنَ لِیُطْفِئُوْا نُوْرَ اللّٰہِ بِاَفْوَاهِهِمْ

۱؎ ہنڈرک ولیم وان اپنی کتاب "تاریخ انسانیت" جس کا ترجمہ فارسی میں جمال زادہ نے کیا ہے صفحات ۱۳۸ اور ۱۳۹ پر صلیبی جنگوں اور دوسری جنگوں میں عیسائیوں پر (باقی اگلے صفحہ پر)

وَاللّٰہُ مُتِمُّ نُوْرِہٖ وَلَوْ کَرِہَ الْکٰفِرُوْنَ ۔

"وہ خدا کے نور کو اپنے منہ کی پھونکوں سے بجھانا چاہتے ہیں لیکن اللہ اپنے نور کو مکمل اور محفوظ رکھے گا خواہ کافروں کو یہ کتنا ہی ناگوار کیوں نہ ہو[1]۔"

ایک آسمانی شخصیت کو سمجھنے کے لیے ایک آسمانی عقل کی ضرورت ہے اور اس کی تعریف و ستائش کے لیے ایک آسمانی زبان درکار ہے۔ ہماری عقل اور ہماری زبان محمد صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کا وصف بیان کرنے سے قاصر ہے۔ آپ کی پاک شخصیت اور عظیم سیرت کے تمام پہلوؤں کا احاطہ کسی طویل بحث و تحقیق سے بھی نہیں کیا جا سکتا کجا کہ ایک مختصر مقالے کے ذریعہ اسے بیان کیا جا سکے، رسول اکرمؐ کی ذات و شخصیت اس سے بہت بالاتر ہے۔

ہم یہاں آپ کے لائے ہوئے طریقے کے ایک جامع مطالعہ کے ذریعہ

(بقیہ حاشیہ گزشتہ سے پیوستہ) مسلمانوں کے غلبے اور اسلام کی پیش رفت کے اسباب بیان کرتے ہوئے کہتا ہے۔ "پیغمبرِ اسلام نے فرمایا کہ جو شخص بھی کفّار سے جہاد کرتے ہوئے اپنی جان قربان کر دے وہ سیدھے جنّت میں داخل کر دیا جاتا ہے۔ اسی لیے مجاہدینِ اسلام مردانہ وار اپنی جانیں قربان کرنے کو دنیائے فانی کی پُرمشقّت زندگی پر ترجیح دیتے تھے اور یہی وجہ تھی کہ مسلمان صلیبی جنگوں میں عیسائیوں پر غلبہ حاصل کرتے رہے۔ جبکہ دینِ عیسوی کے پیرو موت کے بعد کی نامعلوم زندگی سے خوفزدہ رہتے اور اس عارضی دنیا کی نعمتوں اور لذتوں کے پرستار بنے رہتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ آج بھی مسلمان مجاہدین پوری بے خوفی کے ساتھ فرنگی توپوں کے سامنے سینہ سپر ہو جاتے ہیں اور اسی لیے ان کے نزدیک مسلمان بہت خطرناک دشمن ہیں۔

۱؎ سورۂ صف آیت ۸

آپ کی پاک شخصیت پر کچھ گفتگو کریں گے۔ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے اس طریقے کو انسانی معاشرہ تک پہنچایا اور یہ واضح کر دیا کہ انسان کی حقیقی سعادت کا انحصار آپ کے لائے ہوئے اسی طریقے پر عمل کرنے سے ہے۔

انسان کی حقیقت اور کائنات کے بارے میں اس کا نظریہ

پیشِ نظر بحث کو سمجھنے کے لیے ابتدائی طور پر اس بات کو سامنے رکھنا ضروری ہے کہ انسانی جبلت کا اولین تقاضہ اپنی ذات کا تحفظ ہے۔ اس کا مقصدِ زندگی اس کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا کہ وہ اپنے وجود کو باقی رکھنے کے لیے تمام ممکنہ وسائل فراہم کرے اور اپنی تمام فطری اور بنیادی ضروریات کو پورا کرے۔

انسان جب اجتماعی زندگی گزارنے کے لیے پہلا قدم اٹھاتا ہے اور مل جل کر رہنا شروع کرتا ہے، ایک انسانی معاشرے کی بنیاد رکھتا ہے اور پھر اس معاشرہ اور اپنی اس اجتماعی زندگی کے تحفظ کے لیے کچھ قاعدے اور قوانین وضع کرتا ہے تو اسے ایک حد تک اپنی انفرادی آزادی سے دست بردار ہونا پڑتا ہے لیکن اس کی اِس قربانی کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنی انفرادی آزادی کے ایک حصے سے دست بردار ہو کر آزادی کے اس حصے سے بہرہ مند ہو جو اسے اجتماعی زندگی کی صورت میں میسر آتا ہے تاکہ اس طرح وہ اپنے انفرادی وجود کا بہتر سے بہتر طریقے پر تحفظ کر سکے اور اس کی فطری اور بنیادی ضروریات کو عمدہ طریقے پر پورا کر سکے۔

اصل چیز فرد کی نجات، اس کی خوشحالی اور خوش بختی ہے۔ انسانی خلقت اور فطرت کا تقاضہ بھی یہی ہے۔ اجتماع اور معاشرہ کی نجات اور خوش بختی کی حیثیت اسی اصول سے نکلنے والی ایک شاخ کی سی ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ اصل اہمیت

تو اجتماعیت کو حاصل ہو اور فرد کی حیثیت محض ضمنی ہو کر رہ جائے۔ دوسرے الفاظ میں انسانی خلقت اور فطرت کا اصل مقصود فرد کا وجود ہے نہ کہ وہ اجتماعیت جو افراد کے ذریعے وجود میں آتی ہے۔ چونکہ ہر انسانی فرد اپنی فلاح اور کامیابی کا خواہشمند ہوتا ہے اس لیے زندگی گزارنے کے کسی منظم طریقے کو اختیار کرنا اس کے لیے ضروری ہے اور لازماً یہ طریقہ اجتماعیت کا طریقہ ہی ہو سکتا ہے تاکہ وہ احساسِ تحفظ کے تحت زندگی بسر کر سکے۔ اپنے لیے خورد و نوش کا سامان فراہم کرے، آرام و سکون حاصل کرے، شادی بیاہ کرے، اولاد پیدا کرے ـــــ اور ـــــ تمام ضروریات پوری کرنے کے لیے جدوجہد کرے اور اپنی بساط کے مطابق اپنی ضروریات کی تکمیل کے لیے راہ ہموار کرے۔

اجتماعی زندگی گزارنے کا منظم طریقہ کیسا اور کس طرح کا ہو، اس کا انحصار اس بنیادی عقیدے اور تصوّر پر ہے جو انسان اس کائنات کے بارے میں اور خود اپنے بارے میں رکھتا ہے کیونکہ وہ خود اس کائنات کا جزو (لاینفک) ہے۔ یہ بات اس طرح سمجھی جا سکتی ہے کہ انسانوں کا بڑا طبقہ ایسا ہے جو کائنات کے ایک خالق ہونے پر یقین نہیں رکھتا۔ وہ دنیا کے وجود میں آنے کو ایک اتفاقی واقعہ تصوّر کرتا ہے اور وہ انسان کو ایک ایسا مادی وجود قرار دیتا ہے جس کی بقا اس کی پیدائش اور موت کے درمیانی عرصے تک محدود ہے اور اس کے بعد کچھ نہیں ہے۔ اس عقیدے کا حامل طبقہ زندگی بسر کرنے کے طریقوں اور ضابطوں کو اس طرح منظم و مرتّب کرتا ہے کہ وہ دنیا کی چند روزہ مادّی زندگی کی ضروریات کو پورا کر سکیں اور صرف محدود و مادی کامیابیوں کی راہ دکھا سکیں۔

اسی طرح وہ لوگ جو مادّے اور دنیا کی مادّی زندگی پر یقین رکھتے ہیں، ان کا رویّہ بھی اسی طرح کا رویّہ ہوتا ہے۔

جو لوگ اس بات پر یقین رکھتے ہیں کہ اس کائنات کا ایک خالق ہے اور دنیا کا انتظام اور دنیا والوں کی ضروریات مختلف خداؤں کے ہاتھ میں ہیں اور وہ اس بات کو بھی مانتے ہیں کہ انسان کی زندگی صرف یہ مادّی زندگی ہی نہیں ہے وہ زندگی بسر کرنے کے ایسے طریقے کو منظم کرتے ہیں جس سے وہ اپنے خداؤں کی خوشنودی حاصل کر سکیں اور ان کے غیظ وغضب سے بچ سکیں اور اس طرح وہ اپنی زندگی میں کامیابی حاصل کر سکیں اور آئندہ پیش آنے والے ایسے ناگوار حادثات سے خود کو محفوظ رکھ سکیں جو ان کے خیال میں ان کے خداؤں کے غصّے اور ناراضگی کا نتیجہ ہوتے ہیں۔

اس کے برعکس جو لوگ دینِ توحید پر یقین رکھتے ہیں اور ایک حکیم وعلیم قادرِ مطلق خدا پر ایمان رکھتے ہیں اور ہمیشہ باقی رہنے والی ایسی زندگی پر یقین رکھتے ہیں جسے ہلاکت اور موت کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتی۔ یہ لوگ زندگی گزارنے کے ایسے طریقے کو منظّم کرتے ہیں جو دنیا اور آخرت دونوں جہانوں میں ان کی کامیابی اور نجات کا ذریعہ بنے اور انھیں ہمیشہ کی خوش بختی سے بہرہ مند کرے۔ اس سے یہ بات بخوبی ظاہر ہوتی ہے کہ دین دراصل نظامِ زندگی ہے اور زندگی گزارنے کا طریقہ ہے دین اور نظامِ زندگی کے درمیان کوئی فرق نہیں ہے۔

جن لوگوں نے زندگی بسر کرنے کے طریقے اور نظام کو اصل چیز قرار دیا ہے اور دین کو اس سے الگ کر کے محض تقدس واحترام کا مرتبہ دے رکھا ہے اور اس کے ضابطوں کو صرف مذہبی رسوم تک محدود کر رکھا ہے وہ سخت غلطی پر ہیں۔ اسی لیے اسلام زندگی گزارنے کے طریقے اور نظام کو دین قرار دیتا ہے اور اسے ایک ایسی روش کہتا ہے جو انسانیت کے لیے وضع کی گئی ہے اور وہ اس سچے طریقے کو راہِ مستقیم کا نام دیتا ہے اور باطل نظاموں اور طریقوں کو ٹیڑھے اور گمراہ کن راستے قرار دیتا ہے۔

أَنْ لَعْنَةُ اللّٰهِ عَلَى الظّٰلِمِيْنَ ۝ الَّذِيْنَ يَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَيَبْغُوْنَهَا عِوَجًا ۚ وَهُمْ بِالْاٰخِرَةِ كٰفِرُوْنَ ۝ (سورہ اعراف آیت ۴۵)

"اللہ کی لعنت ان ظالموں پر جو لوگوں کو راہ خدا سے روکتے اور اسے ٹیڑھا کرنا چاہتے تھے اور آخرت کے منکر تھے۔"

کائنات کے بارے میں اسلام کا نظریہ

رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جس عقیدے کو اپنے آئین کی بنیاد قرار دیا ہے وہ یہ ہے کہ اس کائنات کا بنانے والا خدائے واحد ہے جو کائنات کے ہر جزو کو اس کے لیے مخصوص درجۂ کمال تک پہنچانے کے لیے اس کی رہنمائی کرتا ہے اور انسان کو بھی جسے اس نے حیاتِ جاوید عطا کی ہے خاص سعادت وکامیابی کی راہ دکھاتا ہے اور اس روش اور راستے کی جانب اس کی راہنمائی کرتا ہے جس پر چل کر وہ نجات وفلاح حاصل کر سکے۔

رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی دعوت کا مخاطب وہ انسان اور ایسا شخص ہے جو فطرتِ انسانی پر قائم ہو اور اللہ تعالیٰ کے عطا کردہ شعور اور ارادہ واختیار سے بہرہ مند ہو اور جس نے بیہودہ افکار اور اندھی تقلید سے اپنی فطرت کو آلودہ نہ کر رکھا ہو۔ اس لیے کہ ایسا سلیم الطبع اور صحیح الفطرت انسان ہی اپنی خداداد فطری صلاحیت کی بنا پر رسولِ اکرمؐ کے پیش کردہ عقیدے اور نظریے کو سمجھنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔

وہ خود معمولی سے اشارے سے سمجھ لیتا ہے کہ یہ عظیم وبے کنار اور منظّم وبسیط کائنات اس پاک ذات کا مظہر ہے جس کی لامتناہی ذات ہر کمال وجمال کا سرچشمہ ہے

اور جو ہر بُرائی اور عیب سے پاک ہے ۔ اس نے اس کائنات کو اور اس میں بسنے والی مخلوق کو فضول اور بے مقصد پیدا نہیں کیا ہے ۔ ایک روزِ آخر آنے والا ہے جس میں انسان کے ہر اچھے اور بُرے عمل کے بارے میں اس سے باز پرس ہو گی ۔ اس عقیدے کی بنا پر انسان کے لیے زندگی بسر کرنے کا ایک ایسا خاص طریقہ ہونا چاہیئے جو اس عقیدے کے تقاضوں کو پورا کرے ۔

تعلیم و تربیت کے لیے صحیح الفطرت انسانوں کا انتخاب چند اسلامی تقاضوں کی تکمیل چاہتا ہے :

۱۔ مساوات کا اصول

اس اصول کو عمومیت کے ساتھ بلا امتیاز تمام افراد پر جاری کیا جائے گا ، کالے اور گورے ـــــ عورت اور مرد ـــــ شریف و پست ـــــ امیر و غریب ـــــ شاہ و گدا ـــــ طاقت ور اور کمزور ـــــ شرقی اور غربی ـــــ قطبی اور خطِ استوا پر بسنے والوں ـــــ عالم اور جاہل ـــــ جوان اور بوڑھے ـــــ اسی طرح زمانۂ حال میں رہنے والوں اور آئندہ پیدا ہونے والوں کے درمیان کسی طرح کا فرق نہیں کیا جائے گا کیونکہ سب انسانی فطرت کے حامل ہونے میں ایک دوسرے کے شریک اور فطرت کے فراہم کردہ وسائل میں باہم حصّہ دار ہیں ۔

مساوات کا یہ تصوّر اور طریقہ صرف اسلام کے پاکیزہ نظام کا ایک حصّہ ہے ۔ اس کے برعکس دنیا کے دوسرے نظاموں میں سے ہر ایک کم و بیش تفریقات و امتیازات کا حامل ہے ۔ جیسے بت پرست مذاہب

یہ پجاریوں اور برہمنوں کے طبقے اور عام لوگوں کے درمیان اور عورت و مرد کے درمیان فرق و امتیاز کے قائل ہیں ۔ اسی طرح یہودیت میں اسرائیل کی اولاد اور دوسرے یہودی ۔ اور عیسائیت میں عورت و مرد کے درمیان امتیاز کیا جاتا ہے ۔ اسی طرح وطنیت کی بنیاد پر اہلِ وطن اور غیر اہلِ وطن کے درمیان فرق کیا جاتا ہے ۔

یہ صرف اسلام ہی ہے جس نے پوری انسانیت کو ایک جیسی اور مساوی قرار دیا ہے اور تفریق و امتیاز کو جڑ سے اکھاڑ پھینکا ہے ۔

اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں ارشاد فرمایا ہے :

" يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنَّا خَلَقْنَاكُمْ مِنْ ذَكَرٍ وَأُنْثَىٰ وَجَعَلْنَاكُمْ شُعُوبًا وَقَبَائِلَ لِتَعَارَفُوا ۚ إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللَّهِ أَتْقَاكُمْ " (سورہ حجرات آیت ۱۳)

" أَنِّي لَا أُضِيعُ عَمَلَ عَامِلٍ مِنْكُمْ مِنْ ذَكَرٍ أَوْ أُنْثَىٰ ۖ بَعْضُكُمْ مِنْ بَعْضٍ ۖ " (سورہ آل عمران آیت ۱۹۵)

" اے لوگو ہم نے تمھیں مرد اور عورت سے پیدا کیا اور پھر ہم نے تمھیں چھوٹے بڑے گروہوں (شعوب و قبائل) میں تقسیم کیا ۔ تاکہ تم ایک دوسرے کو پہچانو (تاکہ ایک اجتماعی معاشرہ وجود میں آئے) تمھارے درمیان سب سے زیادہ معزز وہ ہے جو تم میں سب سے زیادہ پرہیزگار ہے ۔ "

"میں تم میں سے کسی عمل کرنے والے کے عمل کو ضائع نہیں کرتا ہوں خواہ وہ مرد ہو یا عورت (تمھارا ایک حصہ دوسرے حصّے سے ہے) تم سب انسان ہو۔"

۲۔ حقیقت پسندی کا اصول

چونکہ انسان اپنی فطرت کی رو سے حقیقت پسند واقع ہوا ہے اس لیے جو قوانین وضوابط وضع کیے جاتے ہیں وہ حقیقت پسندی کی بنیاد پر وضع کیے جاتے ہیں۔

اس کی توضیح یہ ہے کہ انسان جہاں فطرتاً اپنے احساسات وجذبات کی مدد سے برانگیختہ ہو کر اپنے طبیعی مقاصد کی طرف قدم بڑھاتا ہے وہ فطری طور پر حقیقی اور واقعیت پسندانہ مقاصد کے حصول کے لیے بھی جدوجہد کرتا ہے، وہ محض خیالی اور تصوراتی مقاصد کی طرف نہیں دوڑتا بچہ پیدا ہوتے ہی ماں کے سینے کی طرف ہاتھ بڑھاتا اور دودھ چاہتا ہے یا پھر بھوک کی وجہ سے روتا ہے۔ وہ حقیقتاً دودھ مانگتا ہے نہ کہ دودھ کی خیالی تصویر۔ وہ حقیقی بھوک کی وجہ سے روتا ہے۔ بھوک کے خیال یا اندیشے سے نہیں روتا۔

ہر شخص جسے منافع کی تلاش ہوتی ہے وہ فی الواقع منافع چاہتا ہے نہ کہ منافع کا خیالی خاکہ۔ انسان کے دل میں جب خواہشات اور جذبات کا طوفان اٹھتا ہے اور یہ طوفان حقیقی فائدے اور نقصان کو پس پشت ڈال کر اسے کسی جانب بہا لے جانا چاہتا ہے تو اس موقع پر انسان کی قوتِ تمیز (عقل) خواہشات وجذبات کے منہ میں لگام دیتی ہے

اور انھیں ٹھنڈا کر کے اچھے اور برے نتائج اور صلاح وفساد کے دونوں رخ انسان پر واضح کر دیتی ہے۔

یہ انسان کی عقل اور قوتِ تمیز ہی ہے جو بیمار کو نقصان دہ چیزوں کے کھانے سے روکتی ہے اگرچہ اس کا دل چاہ رہا ہوتا ہے۔ خطرناک کام میں ہاتھ ڈالنے سے روکتی ہے اور آخر کار آزادئ عمل کے ایک اہم حصّے کو اس کے ہاتھوں سے لے لیتی ہے۔

عقل وہ تنہا اعزاز اور امتیاز ہے جو تمام مخلوقات کے مقابل انسان کو عطا کیا گیا ہے اور یہ حقیقت پسندی اور واقعیت بینی کا ایک بہترین زیور ہے جس سے انسان کو سنوارا گیا ہے۔

رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم انسانیت کے لیے جو آئین اور قانون لے کر آئے ہیں ان کو حقیقت پسندی کی بنیاد پر تشکیل دیا گیا ہے نہ کہ لوگوں کی خواہشات کی بنیاد پر، یعنی اصول یہ ہے کہ انسان کو وہ کام کرنا چاہیے جس میں اس کی صلاح اور فلاح ہو، خواہ اس کا دل اس کام کو نہ کرنا چاہے، اسے ایسا کوئی کام نہیں کرنا چاہیے جس کے لیے اس کا دل تو بہت چاہتا ہے لیکن وہ اس کے لیے بے فائدہ اور مضرت رساں ہے اور اس کی سعادت ونیک بختی کے خلاف ہے۔

کسی قوم کو جب بھی اپنی فلاح وبہبود کے لیے کسی عمل کو انجام دینا پڑے تو اسے لازماً یہ کام سرانجام دینا چاہیے اگرچہ خود قوم کی خواہشات کے خلاف ہو اور اسی طرح ایسا کوئی عمل ہرگز سرانجام نہیں دینا چاہیے جس کو اکثریت کر گزرنا چاہتی ہو لیکن درحقیقت مصلحت کے خلاف ہو۔

قرآن کریم کی اصطلاح میں ایسے کام کو جو حقیقت اور حقیقی مصلحت

کے مطابق ہو "حق" کا نام دیا گیا ہے اور یہ "حق" کہلانے والا کام ہی وہ واحد ہدف ہے جو انسان کی فکر و عمل کا مقصود قرار پانا چاہیے۔ اسی کے لیے اسے کمرِ ہمت باندھنی چاہیے اور اسی کی جانب اسے اپنے قدم بڑھانے چاہئیں۔

"فَمَاذَا بَعْدَ الْحَقِّ إِلَّا الضَّلَالُ ج"

(سورہ یونس آیت ۳۲)

"حق کے بعد پھر گمراہی کے سوا اور کیا باقی رہ جاتا ہے۔"

"وَلَوِ اتَّبَعَ الْحَقُّ أَهْوَاءَهُمْ لَفَسَدَتِ السَّمٰوٰتُ وَالْأَرْضُ"

(سورہ مومنون آیت ۷۱)

"اور اگر حق ان کی خواہشات کی پیروی کرتا تو زمین اور آسمان فساد سے بھر جاتے۔"

ایک عدد بادام اگر وہ زمین میں دبا ہوا ہو اور اسے سازگار حالات میسر آجائیں تو چند روز بعد اس کا چھلکا پھٹنے لگے گا اور پھر زمین کا سینہ پھاڑ کر ایک تازہ و سبز کونپل باہر نکل آئے گی اور یہ کونپل آہستہ آہستہ ایک پودے کی صورت اختیار کرے گی اور یہ پودا اپنی جڑوں اور ریشوں کے ذریعے زمین سے غذا حاصل کرنے لگے گا اور پھر نشو و نما پا کر بادام کے ایک تناور درخت میں تبدیل ہو جائے گا۔ اپنی شاخوں اور شگوفوں کے ساتھ پھول پھل دینے لگے گا۔

اسی طرح جب ایک حیوانی نطفہ رحمِ مادر میں قرار پاتا ہے تو وہ ایک مقررہ مدت کے اندر مخصوص جسم اور شکل و صورت کے ساتھ نشو و نما

پانے لگتا ہے، یہاں تک کہ وہ ہر اعتبار سے مکمل ہو جاتا ہے۔ اگر ہم دنیا کی مختلف مخلوقات کی پیدائش اور ان کے عملِ نشو و نما پر نظر ڈالیں تو ہم پر یہ حقیقت پوری طرح واضح ہو جائے گی کہ ان میں سے ہر ایک کے لیے اس کے خالق نے ترقی اور کمال تک پہنچنے کی ایک راہ مقرر کر دی ہے اور وہ اس راہ پر گامزن رہ کر اپنی مقررہ حدِ کمال کو پہنچ جاتا ہے۔ اپنی پیدائش کے اولین دن سے اس کو اپنی منزلِ کمال کا علم ہوتا ہے اور اپنے اس سفرِ ارتقا میں وہ اپنے متعینہ راستے سے ذرا بھی ادھر ادھر نہیں ہوتا۔ منزلِ کمال اس کے پیشِ نظر ہوتی ہے اور وہ بتدریج اور مسلسل اس کی جانب بڑھتا رہتا ہے۔ کوئی دوسری راہ اختیار کر کے کسی دوسری منزل پر نہیں پہنچتا جیسے ایک بادام اپنی نشو و نما کے مقررہ راستے سے ہٹ کر کسی اور راستے پر پڑ کر ایک گھوڑے کی شکل نہیں اختیار کرتا۔ اسی طرح ایسا کبھی نہیں ہوتا کہ ایک گھوڑا جب صبح بیدار ہو تو وہ گھوڑا نہ رہے ایک بادام کے درخت کی شکل اختیار کر لے۔

فطرت ہر مخلوق کی رہنمائی کرتی ہے اور اسے نشو و نما اور ارتقاء کے مقررہ راستے پر گامزن رکھتی ہے اور حدِ کمال تک پہنچاتی ہے۔ پھر تمام مخلوقات کو ایسی قوتیں اور وسائل دیے گئے ہیں جن سے کام لے کر وہ تمام نفع بخش چیزوں کو حاصل کرتی ہیں اور نقصان رساں چیزوں سے خود کو محفوظ رکھتی ہیں۔ جیسے پرندے دانہ کھاتے ہیں، گائے اور بکریاں گھاس اور چارہ کھاتی ہیں، بھیڑیے، چیتے اور باز گوشت کھاتے ہیں۔ ان میں سے ہر ایک کو اللہ تعالےٰ نے ایسے اعضا دیے ہیں جن کے لیے ایک خاص طرح کی غذا موزوں ہوتی ہے۔ اسی طرح ان

حیوانات کو دفاعی وسائل بھی فراہم کیے گئے ہیں۔ مرغ اپنی چونچ سے اپنا دفاع کرتا ہے۔ گائے اور بکری اپنے سینگوں سے اپنا دفاع کرتے ہیں۔ سانپ، بچھو اور شہد کی مکھی کو اس کام کے لیے ڈنک سے لیس کیا گیا ہے۔ شیر اور چیتے اپنے دانتوں اور پنجوں سے اپنا دفاع کرتے ہیں۔ ہرن اپنی تیز رفتار ٹانگوں کی مدد سے بھاگ کر اپنا دفاع کرتا ہے۔ غرض یہ کہ ہر جاندار کو ایک موزوں دفاعی ہتھیار سے مسلح کیا گیا ہے۔

مختصر یہ کہ ان مخلوقات میں سے ہر ایک کی زندگی اور اس کے وجود کا ایک خاص مقصد اور ہدف ہے اور وہ ایسے تمام وسائل کو استعمال کرتے ہیں جو انھیں ان کے ہدف کی طرف لے جانے کے لیے مفید ہوتے ہیں۔ اور ان کی مدد سے وہ ضروری اندازے لگاتے ہیں اسی کا نام تقدیر اور عمومی ہدایت ہے۔ جس کی طرف قرآن کریم نے اشارہ کیا ہے اور اسے اللہ تعالےٰ سے منسوب کیا ہے:

" رَبُّنَا الَّذِيٓ اَعْطٰى كُلَّ شَيْءٍ خَلْقَهٗ ثُمَّ هَدٰى "

(سورہ طٰہٰ آیت ۵۰)

" اَلَّذِيْ خَلَقَ فَسَوّٰى ۔ وَالَّذِيْ قَدَّرَ فَهَدٰى ۔

(سورہ اعلیٰ ۔ آیت ۲ ۔ ۳)

" ہمارا رب وہ ہے جس نے ہر چیز کو اس کی فطرت عطا کی اور پھر اس کی رہنمائی کی۔"

" وہ خدا کہ جس نے اندازہ مقرر کیا اور اس کے

مطابق ہدایت و رہنمائی فرمائی۔"

انسان جو اللہ تعالیٰ کی مخلوقات میں سے ایک مخلوق ہے وہ بھی اس قاعدے سے مستثنیٰ نہیں ہے۔ اس کی مخصوص فطرت اسے راستہ دکھاتی ہے جو اسے زندگی میں اختیار کرنا ہے اور اسے ان ذمہ داریوں اور فرائض سے آگاہ کرتی ہے جو اسے ادا کرنی ہیں۔

قرآن کہتا ہے:

" مِنْ اَيِّ شَيْءٍ خَلَقَهٗ ۔ مِنْ نُّطْفَةٍ خَلَقَهٗ فَقَدَّرَهٗ ۔ ثُمَّ السَّبِيْلَ يَسَّرَهٗ ۔"

(سورۂ عبس آیات ۱۸ تا ۲۰)

" انسان کو کس چیز سے پیدا کیا نطفے سے، پس ایک اندازہ مقرر کیا، پھر اس کے لیے راہِ (فلاح) آسان کر دی۔"

اس بحث پر اور پچھلی بحث پر ذرا غور کرنے سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ ان دونوں بحثوں کا نتیجہ ایک ہی ہے اور وہ یہ کہ انسان کو اپنی حقیقت پسندی کی جبلت کی مدد سے وہ افعال و اعمال انجام دینے ہیں جو حق (واقعی مصلحت) کے مطابق ہوں۔ یہ وہ افعال اور اعمال ہیں کہ انسان کی فطرت اپنے مخصوص وسائل کے ذریعہ جن کی جانب اس کی رہنمائی کرتی ہے اسی کو دینِ حق کہا گیا ہے۔ دینِ فطرت بھی کہہ کر اسے فطرت سے نسبت دی گئی ہے:

" فَاَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّيْنِ حَنِيْفًا ؕ

فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِیْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَیْهَا ۭ لَا تَبْدِیْلَ لِخَلْقِ اللّٰهِ ۭ ذٰلِكَ الدِّیْنُ الْقَیِّمُ ۙ

(سورۂ روم - آیت ۳۰)

" وَنَفْسٍ وَّمَا سَوّٰىهَا - فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰىهَا - قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰىهَا - وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰىهَا - "

(سورہ شمس آیات ۷ تا ۱۰)

" دین کے قبول کرنے میں جو دینِ حنیف (میانہ روی کا دین) ہے مضبوطی سے جما رہ - اور اس کی طرف سے اپنا رخ نہ موڑ کیونکہ یہ دین وہی خدائی فطرت کا دین ہے جس پر انسان کو پیدا کیا گیا ہے خدائی فطرت ناقابل تبدیل ہے - یہی وہ دینِ قیّم ہے جو انسانی معاشرہ کو فلاح و سعادت سے بہرہ مند کرتا ہے اور اس کے مقصد کی تکمیل کرتا ہے - "

" اور نفس انسانی کی اور اس ذات کی قسم جس نے اسے ہموار کیا - پھر اس کی بدی اور اس کی پرہیزگاری اس پر الہام کردی، یقیناً فلاح پا گیا وہ جس نے نفس کا تزکیہ کیا اور نامراد ہوا وہ جس نے اس کو تباہ کیا - "

ایک دوسرے پہلو سے غور کریں تو یہ بات واضح ہوتی ہے

کہ تخلیق کا یہ سارا کام اللہ تعالیٰ کا ہے اور اسی سے تعلق رکھتا ہے اس لیے کائنات میں جو بھی خوبی اور حسن نظر آتا ہے اس کا تعلق اسی کی ذات سے ہے اسی لیے فطرتِ انسانی کے اس تقاضے کو جس کا تعلق انسانی اعمال و افعال سے ہے ارادۂ خداوندی کا نام دیا گیا ہے - (لیکن یہ ارادہ' ارادۂ تشریعی ہے اور اس کا نتیجہ ہدایت و رہنمائی اور ذمہ داری و جوابدہی کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے - پھر دوسرا ارادۂ خداوندی، ارادۂ تکوینی ہے جو ہرگز تبدیل نہیں ہوتا) اور انسان پر جو فرائض اور ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں، وہ امر و نہی خداوندی کے تحت آتی ہیں -

" وَرَبُّكَ يَخْلُقُ مَا يَشَاۗءُ وَيَخْتَارُ ۭ مَا كَانَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ ۭ

(سورۂ قصص آیت ۶۸)

" تیرا رب جو کچھ چاہتا ہے پیدا کرتا ہے اور وہ اپنے کام کے لیے جسے چاہتا ہے منتخب کر لیتا ہے یہ انتخاب ان لوگوں کے کرنے کا کام نہیں ہے - "

یہ دین ان فرائض و احکام اور فرامین کا مجموعہ ہے جو پروردگارِ عالم کی طرف سے جاری کیے گئے ہیں - جو شخص بھی اس دین کے اعتقادی اور عملی اصولوں کی پیروی کرتا ہے اور ارادۂ خداوندی کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دیتا ہے وہ مسلم کہلاتا ہے اور اسی لیے قرآن کریم میں اس دین کو دینِ اسلام کا نام دیا گیا ہے :

" اِنَّ الدِّيْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُ "

(سورہ آل عمران آیت ۱۹)

"وَمَنْ يَّبْتَغِ غَيْرَ الْاِسْلَامِ دِيْنًا فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْهُ"

(سورہ آل عمران آیت ۸۵)

"اللہ کے نزدیک دین صرف اسلام ہے' اسلام کے سوا جو شخص کوئی اور طریقہ اختیار کرنا چاہے اس کا وہ طریقہ ہرگز قبول نہ کیا جائے گا۔"

۳۔ مادہ اور روح کے بارے میں اعتدال کا اصول

انسان کو اسلام کی طرف دعوت کی تیسری توجیہ یہ ہے کہ اسلام نے مادیت اور روحانیت کے درمیان ایک راہ اعتدال اختیار کی ہے۔ اس آسمانی آئین کی یہ ایک عظیم خصوصیت اور اس کا ایک بے مثال شاہکار ہے۔

اس کے برعکس یہودیت اور یہودیوں کی تحریف شدہ مقدس کتاب توراۃ کی تعلیمات پر جب ہم نظر ڈالتے ہیں تو یہ واضح ہو جاتا ہے کہ انسانی معنویات و روحانیات سے وہ کوئی تعلق نہیں رکھتیں۔ اسی طرح ذرا عیسائیت کا جائزہ لیجیے۔ حضرت مسیح کی اس ایک تصریح کے مطابق جو نقل کی جاتی ہے "عیسائی مذہب دنیا کی مادی زندگی سے کوئی سروکار نہیں رکھتا"[1] جہاں تک ہندومت'

[1] یہ نکتہ اس بحث کے اندر موجود ہے جو مسیح علیہ السلام کی گرفتاری کے بعد آپ کے اور ہیرودیس کے درمیان ہوئی۔ اس کا اناجیل میں بھی ذکر آتا ہے۔ کتاب "داستانِ بشر" میں بھی یہ نکتہ اس تاریخی خط میں مذکور ہے جو قصۂ مسیح کے ذیل میں درج کیا گیا ہے۔ اس میں صریحاً حضرت عیسیٰ سے یہ بات نقل کی گئی ہے۔

بدھ مت، مجوسیت، مانویت اور صابئیت کا تعلق ہے، یہ مذاہب کم و بیش معنویت و روحانیت سے تعلق رکھتے ہیں لیکن ان مذاہب نے روحانیت کے راستے کو مادّی زندگی کے راستے سے بالکل جدا کر رکھا ہے اور ان دونوں کے درمیان کسی تعلق کو باقی رہنے نہیں دیا ہے۔ یہ صرف دینِ حنیف اسلام ہے جس نے اس اعتدال کی راہ کی طرف رہنمائی کی ہے' جو انسانی فطرت کی بنیاد پر استوار ہے۔

اصل بات یہ ہے کہ اہلِ دنیا کی اکثریت مادی ترقی کے سوا اپنا کوئی ہدف نہیں رکھتی۔ اس نے اپنی پوری زندگی اسی مقصد کے لیے وقف کر رکھی ہے زیادہ سے زیادہ دولت کمانے اور مادی لذتوں سے لطف اندوز ہونے کے سوا کوئی خیال ان لوگوں کے ذہن میں نہیں آتا۔ وہ شب و روز حصولِ معاش میں مصروف رہتے ہیں اور وہ اس فانی دنیا کی مادی زندگی سے نظریں ہٹا کر کسی اور جانب دیکھنے کے لیے بالکل آمادہ نہیں ہیں۔

اس کثیر گروہ کے مقابل ایک دوسرا گروہ ہے جو تعداد میں بہت کم ہے۔ اس گروہِ قلیل سے تعلق رکھنے والے لوگ اس دنیا کی حقیقت اور اس کی بے ثباتی پر غور و فکر کرتے ہیں اور وہ اس حقیقت سے واقف ہیں کہ اس دنیا میں ہر لذت اپنے ساتھ سینکڑوں قسم کے رنج و الم رکھتی ہے اور بادۂ عیش کا ہر گھونٹ صدہا زہر بھرے ڈنک اپنے ساتھ لیے ہوئے ہے اور ہر خوشی کے ساتھ بے شمار رنج اور ہر کامیابی کے ساتھ ان گنت دکھ اور غم موجود ہیں۔ ہر وصال کے ساتھ فراق، ہر صحت مندی کے ساتھ بیماری اور ہر زندگی کے ساتھ موت کا رشتہ قائم ہے اور یہ کہ اس محدود زندگی اور اس پرفریب سراب کی دوسری جانب ایک کبھی نہ فنا ہونے والی دنیا ہے، جس میں

اس فانی دنیا کے رنج وغم اور تکالیف کا نام ونشان نہیں ملتا۔ اس دوسری دنیا کی ساری خوش نصیبیاں نیک انسانوں کا حصہ ہیں اور وہاں کی کامیابی ان مردانِ حُر کا نصیبہ ہے جو شرافت ونیکی کی راہ پر گامزن رہے ہیں۔

اپنی اس فکر اور اپنے اس عقیدے کی بنا پر ان لوگوں نے بساطِ دنیا کو الٹ دیا ہے اور دنیا کی ہر خوشنما اور بدنما چیز سے اپنی آنکھیں پھیر لی ہیں کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ دنیا کی کامیابی خواہ کتنی ہی لذیذ ہو آخر کار ایک دن اس کا انجام نا امیدی، حسرت اور تلخ کامی کے سوا اور کچھ نہیں ہوگا۔ اسی لیے یہ لوگ ایک جانب کھڑے، دور سے یا قریب سے اس جہانِ ابدی کے جمال وکمال کے نظّارے میں مصروف ہیں جو اپنی بے پایاں وسعت کے ساتھ پوری کائنات پر چھا گیا ہے۔

یہ دونوں طرح کے گروہ ہمارے اس دور میں بھی موجود ہیں اور گزشتہ زمانوں میں بھی موجود رہے ہیں۔ تاریخ کی گواہی کے مطابق یہ دونوں گروہ ہر دور میں ہمیشہ موجود رہے ہیں۔ انسانوں کے درمیان ان دونوں طرح کے گروہوں کا موجود رہنا خود اس بات کا ثبوت ہے کہ انسان اپنی خداداد فطرت کی بنا پر نہ صرف اپنی زندگی کے مادّی اور روحانی دونوں راستوں پر گامزن رہنا چاہتا ہے بلکہ انھیں درست بھی رکھنا چاہتا ہے کیونکہ اگر وہ اجتماعی زندگی کا دروازہ اپنے اوپر پوری طرح بند کر دے اور ہاتھ پر ہاتھ دھر کر بیٹھ جائے اور تلاش وجستجو کی راہ ترک کر دے تو اسے بہت جلد اپنی زندگی سے کنارہ کش ہو جانا پڑے گا۔ اس صورت میں جب وہ مادّی زندگی سے منہ موڑ لے گا تو اسے اپنی روحانی زندگی سے بھی محروم ہونا پڑے گا اگر وہ روحانی زندگی سے محروم ہو جائے گا تو

وہ اس عقل ودانش سے بھی ہاتھ دھو لینے پر مجبور ہوگا جو اسے دنیا کے سارے حیوانات پر برتری عطا کرتی ہے اور پھر وہ حقیقت اور حقیقت پسندی کی راہ ترک کر کے حیوانات کی صف میں جا شامل ہوگا۔

ایک حقیقت پسند اور فطرت کی راہ پر چلنے والا انسان کسی صورت میں یک رُخی زندگی نہیں اختیار کر سکتا۔ وہ صرف مادیت یا صرف روحانیت پر انحصار نہیں کر سکتا۔ اس لیے کہ اس مادی دنیا میں نہ مادیت کے بغیر زندگی گزاری جا سکتی ہے اور نہ روحانیت کے بغیر خدا شناسی اور خدا پرستی اپنا کوئی مفہوم ومدعا پیدا کر سکتی ہے۔ ہم نے اس سے قبل عیسائیت اور یہودیت کا ذکر کیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ان دونوں مذاہب میں سے ہر ایک نے اپنے وقت کے تقاضوں کی بنا پر دونوں پہلوؤں میں سے کسی ایک پر زیادہ زور دیا ہے۔

موسیٰ کلیم اللہ کے دَور میں بنی اسرائیل جو فرعونِ مصر کے اقتدار کے تحت غلامی اور پسماندگی کی زندگی گزار رہے تھے، وہ تمام انسانی حقوق سے محروم کر دیے گئے تھے اور ان کے ساتھ جانوروں کا سا سلوک کیا جاتا تھا۔ موسیٰ علیہ السلام نے بنی اسرائیل کو فرعون کی غلامی سے نجات دلانے کے بعد اپنے وقت کا بڑا حصہ داخلی امور کی تنظیم، اجتماعی قوانین کی تبلیغ اور اپنی قوم کے لیے ایک مسکن کی فراہمی میں صرف کیا اور ساتھ ہی آپ نے روحانی زندگی کا بھی درس دیا۔

اس کے برعکس مسیح علیہ السلام کی بعثت کے زمانے میں اگرچہ کہ بنی اسرائیل رومی حکومت کے زیر تسلّط تھے لیکن وہ اپنے منظّم ادارے رکھتے تھے اس کے باوجود اُن کے مذہبی رہنماؤں اور با اثر افراد نے تورات کو طاقِ نسیاں

میں اٹھا کر رکھ دیا تھا اور روحانیت کو وہ اپنے مادی مفادات کے حصول اور عام لوگوں کے استحصال کے لیے استعمال کرتے تھے، اسی لیے مسیح علیہ السلام کے لیے یہ ضروری تھا کہ وہ روحانی زندگی پر زور دیں اور اسی کے لیے اپنی زیادہ تر کوششیں صرف کریں اور اپنی تعلیمات کے اکثر حصّے کو اسی کے لیے مخصوص کر دیں۔

جیسا کہ ہم پہلے اشارہ کر چکے ہیں اسلام نے اپنی تعلیمات میں وہ اعتدال کی راہ اختیار کی ہے جو مادی اور روحانی زندگی کے درمیان سے گزرتی ہے حقیقت یہ ہے کہ اسلام نے دو طرح کی زندگیوں میں جو ایک دوسرے کی متضاد ہیں ایک طرح کی ہم آہنگی پیدا کی ہے اور انھیں ایک دوسرے کے ساتھ ملا دیا ہے اور فی الواقع انسان اپنی تکمیل کے لیے اس کے سوا اور کوئی راہ نہیں رکھتا۔

یہ بات ظاہر ہے کہ مخلوقات کی مختلف انواع میں سے ہر نوع فطری عمل اور فطری جستجو کے ذریعہ ہی اس کمال تک پہنچتی ہے جو اُس کی زندگی کا ہدف ہے اور اس کی یہ جدّ وجہد ان قوتوں اور وسائل پر منحصر ہے جن سے اس کے وجود کو سنوارا گیا ہے۔

انسان جو مخلوقات کی انواع میں سے ایک نوع ہے اس کلّی حکم اور عمومی اصول سے مستثنیٰ نہیں ہے۔ انسان ایک روحانی وجود رکھتا ہے جو ہمیشہ کی اور ابدی زندگی کے لیے پیدا کیا گیا ہے، فنا اور تباہی اسے نہیں چھو سکتی اور وہ اپنے پسندیدہ عمل اور کوشش کے ذریعہ اس ہدفِ کمال کو پہنچ سکتا ہے جو ہر سعادت، ہر خوش نصیبی اور ہر کامرانی سے بالاتر ہے۔ ساتھ ہی اس کا روحانی و آسمانی وجود ارضی جسم کا پابند ہے۔ اس جسم کے اندر وہ آلات اور وسائل رکھے گئے ہیں جن کی مدد سے وہ کام کرتا ہے اور وہ قوّتیں جو ان

آلات کو حرکت میں لاتی ہیں، بدن کے ساتھ ایک طرح کا تعلق رکھتی ہیں، مزید یہ کہ انسان کی فطرت، معاشرت اور تمدن کی جانب اس کی رہنمائی کرتی ہے اور بلاشبہ یہ رہنمائی زندگی کے ہدف تک پہنچانے اور نقطۂ کمال تک لے جانے کے لیے ہوتی ہے اور اس کمال اور سعادت کا تعین فطرت نے کیا ہے اور یہ کمال وسعادت کوئی خیالی اور وہمی چیز نہیں ہے۔ ایک پھول دینے والے درخت کا کمال اور خوش بختی اس بات میں مضمر ہے کہ وہ اپنی طبعی نشوونما کو پہنچے اور اپنی فطرت کی بتائی ہوئی راہ پر چل کر پھول کھلائے نہ کہ کسی زریں گل دان کی زینت بنے اور کسی قصرِ زرنگار کے حسن میں اضافہ کرے۔

پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ انسان ان مادّی وسائل کو استعمال کیے بغیر جو فطرت نے اسے عطا کیے ہیں اور اجتماعی زندگی اختیار کیے بغیر کمال وسعادت کی منزل پر پہنچ جائے اور صدفی صد اپنے حقیقی مقصد کو حاصل کر لے۔

اسلام نے انسان کی مادّی زندگی کے دائرے کو تعلیم وتربیت کا میدان قرار دیا ہے کیونکہ یہ مادی زندگی ہی اس کی اجتماعی زندگی ہے اور اس کے اندر وہ تمام مادی وسائل کو روبکار لاتا ہے اور پھر وہ انسانی فطرت اور خلقت کی رہنمائی میں اپنی انفرادی اور اجتماعی اور کلّی وجزئی سرگرمیوں کے لیے بڑے وسیع قوانین وضوابط وضع کرتا ہے جو بالآخر اس کی مکمل تربیت اور تکمیل کا لائحہ عمل بن جاتے ہیں۔ ان ضوابط کا ایک حصّہ وہ فرائض اور ذمّہ داریاں ہیں جو اس کے خالق اور ربّ کے تعلق سے اس پر عائد ہوتی ہیں۔ ان میں اللہ تعالیٰ کی ربوبیت کے مقابل عبودیت اور بندگی کا رویہ اختیار کرنا شامل ہے اور اس کے 'غنا اور بے نیازی' کے مقابل 'فقر اور نیاز مندی' اس کی 'عزّت وعظمت' کے مقابل ذلّت، اس کی کبریائی وبزرگی کے مقابل عاجزی، اس کے

علم کے مقابل لاعلمی، اس کی قدرت کے مقابل بے لبسی، اس کی مشیت اور ارادے کے مقابل تسلیم و رضا کا طرزِ عمل اختیار کرنا شامل ہے اور جہاں تک ممکن ہو اجتماعیت کا اختیار کرنا اس میں شامل ہے جیسے اظہارِ عبودیت کے لیے روزانہ کی نمازوں میں جماعت کی پابندی، عید کی نمازوں کا باجماعت ادا کرنا اور پھر نماز جمعہ کے لیے بڑا اجتماع پھر حج میں ایک بہت بڑے اجتماع کا دستور وضع کیا گیا ہے۔

ان ضوابط کے ایک دوسرے حصّے کا تعلق ان فرائض اور ذمّہ داریوں سے ہے جو لوگوں پر اجتماعی اور معاشرتی باہمی تعلقات کے بارے میں عائد ہوتی ہیں، البتہ ان فرائض کے سلسلے میں جنھیں قوانین اسلامی کا نام دیا گیا ہے پروردگار عالم کے سامنے جوابدہی کو بنیاد کی حیثیت دی گئی ہے۔ کیونکہ تنہا اسی کے ارادے اور مرضی کے سامنے سرِ تسلیم خم کیا جانا چاہیئے۔ یہی اس کی تخلیق کا تقاضہ ہے۔

تمام اعمال تین اصولوں کے تحت انجام دیے جانے چاہئیں:

- □ —— ایک توحید
- □ —— دوسرا نبوت —— اور ——
- □ —— تیسرا معاد یا آخرت

قرآن کا فرمان ہے:

"قُلْ يَآاَهْلَ الْكِتٰبِ تَعَالَوْا اِلٰى كَلِمَةٍ سَوَآءٍۢ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ اَلَّا نَعْبُدَ اِلَّا اللّٰهَ وَلَا نُشْرِكَ بِهٖ شَيْــًٔـا وَّلَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ ؕ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَقُوْلُوا اشْهَدُوْا بِاَنَّا مُسْلِمُوْنَ۔"

"اے پیغمبر اہل کتاب سے کہہ دو کہ آؤ ہم ایک بات پر اتفاق و اتحاد کرلیں اور وہ یہ کہ ہم خدا کے سوا کسی کی پرستش نہ کریں اور ہم میں بعض خدا کو چھوڑ کر بعض دوسروں کو اپنا ارباب (وہ لوگ جن کے ہاتھوں میں اپنی قسمت کا فیصلہ دے دیا جائے اور ان کی مرضی کی پیروی کی جائے) نہ بنا لیں۔ اگر اہل کتاب نے یہ بات نہ مانی تو کہہ دو کہ ہم نے خدا کے آگے سرِ تسلیم خم کر دیا ہے اور ہم اس کے سوا کسی کی پرستش نہیں کرتے اور اس کے حکم اور ارادے کے سوا کسی کی پیروی نہیں کرتے (یہی فطرت اور آفرینش کا تقاضہ ہے)"

(سورہ آل عمران آیت ۶۴)

ہمارے اس بیان سے یہ بات پوری طرح واضح ہوجاتی ہے کہ اسلام کے مقدس آئین میں زندگی بسر کرنے کا ایک ایسا رویّہ اور طریقہ دیا گیا ہے جس کے تحت انسان کی اجتماعی اور مادی زندگی کو ایک ایسے گہوارے کی حیثیت حاصل ہوجاتی ہے جس میں اس کی معنوی اور روحانی زندگی پروان چڑھتی ہے۔

ایک مسلمان فرد جو اسلامی احکام کی پابندی کرتا اور قوانین اسلامی کو نافذ کرتا ہے وہ ایک ایسی معنوی نورانیت سے بہرہ مند ہوتا ہے جو اس کے تمام انفرادی اور اجتماعی اعمال کو نورانی بنا دیتی ہے اور انھیں پاکیزگی عطا کرتی ہے۔ ایسا شخص جب لوگوں کے درمیان ہوتا ہے تو اس وقت بھی وہ اپنے خدا کے ساتھ ہوتا ہے۔ وہ ایک انجمن میں رہتے ہوئے بھی خلوت گاہِ راز میں اپنا وقت گزارتا ہے

وہ اپنی مادی ضروریات کی تکمیل کے لیے دوڑ دھوپ کرتا نظر آتا ہے ۔ اُسے تلخ وشیریں ـــــ خوشگوار و ناخوشگوار ـــــ اچھے اور بُرے حالات سے سابقہ پیش آتا ہے، اس کے باوجود وہ اپنے سینے میں ایک پُرسکون اور مطمئن دل رکھتا ہے ۔ وہ جس جانب بھی دیکھتا ہے اسے پروردگار عالم کا چہرہ نظر آتا ہے۔

"فَاَیْنَمَا تُوَلُّوْا فَثَمَّ وَجْہُ اللّٰہِ"

(سورہ بقرہ آیت ۱۱۵)

"تم جس جانب بھی رُخ کرو اسی طرف اللہ کا رُخ ہے"

اب یہ بات واضح ہوگئی ہے کہ ایک فرمانبردار مسلمان جب اپنی معنوی اور روحانی زندگی کو اپنی مادی زندگی کے ہر گوشے پر پھیلا دیتا ہے تو وہ جہاں بھی ہوتا ہے اور جس کام میں بھی مصروف رہتا ہے، اپنے خدا سے اس کا تعلق برقرار رہتا ہے اور دنیا کی ہر مادی مصروفیت اس کے لیے ایک آئینے کی طرح ہوتی ہے جو خدا کی طرف اس کی رہنمائی کرتا ہے۔

اس کے برعکس بعض دوسرے لوگ جو روحانی زندگی کی تلاش میں ہوتے ہیں وہ عام دنیوی زندگی اور فطری زندگی کو ایک ایسا حجاب سمجھتے ہیں جو ان کے اور حقیقت کے درمیان حائل ہے اور وہ عام دنیوی زندگی کو ترک کرکے نصاریٰ کے راہبوں کی طرح یا ہندی برہمنوں کی مانند یا تپسیا کرنے والے جوگیوں کی طرح غیر فطری زندگی بسر کرنا شروع کر دیتے ہیں تاکہ وہ روحانی زندگی حاصل کرسکیں اور اپنی روحانیت کی تکمیل کرسکیں۔

ایک عام دنیوی اور مادی زندگی بسر کرنے والے کے نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو رہبانیت کی یہ زندگی بڑی سخت ہے ۔ اس کے لیے بڑی استقامت

اور بڑے قوی ارادے کی ضرورت ہوتی ہے ۔

جو لوگ کہ اسلامی قانون کے مطابق اجتماعی زندگی کے ذریعہ معنوی اور روحانی زندگی حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں وہ بخوبی جانتے ہیں کہ رہبانیت اختیار کرنے والوں کا راستہ، اسلام کے راستے سے زیادہ آسان ہے، حقیقت یہ ہے کہ تارک الدنیا لوگوں نے دنیا ترک کرکے اپنے لیے ایک گوشۂ راحت حاصل کرلیا ہے۔ وہ دنیوی اور مادّی زندگی کی مسلسل جدوجہد سے فرار کی راہ اختیار کرتے ہیں اور وہ اس راستے کو خود پر بند کرلیتے ہیں جو راہ کمال ہے اور جسے فطرت نے ہموار کیا ہے اور جس پر چلنے کے لیے وسائل فراہم کیے ہیں ۔ فطرت کی اس راہ کو ترک کرکے انھوں نے اپنے لیے ایک نیا راستہ خود بنایا ہے۔

تو کیا وہ اس صورت میں اس ہدفِ کمال کو حاصل کرسکیں گے جو فطرت نے انسان کے لیے مقرر کیا ہے ؟

یہ حقیقت پیش نظر رہنی چاہیے کہ دنیا اور جو کچھ دنیا میں ہے وہ خدا کا پیدا کردہ ہے اور موجوداتِ دنیا میں سے ہر موجود خدا کی نشانی ہے اور وہ ایک آئینۂ خدا نما ہے ۔

انسان اپنے گوناگوں حالات کے ساتھ ان ہی موجودات میں سے ایک ہے، اسے اپنی "خداشناسی اور خودشناسی" کی معنوی و روحانی زندگی میں ہر حال میں خدا کو پہچاننا چاہیے اور خدا کی کامل معرفت کے لیے اپنے اطراف موجودات تمام آئینوں سے جمالِ حق کا نظارہ کرنا چاہیے۔

بصورتِ دیگر ـــــ

انسان کو اپنی کوشش سے ناقص معرفت یا مکمل جہالت کے سوا اور کچھ حاصل نہ ہوسکے گا۔

۴ - اسلام کی رُو سے علم و آگہی

ہر وہ شخص جس نے دنیا کے ادیان و مذاہب کا کچھ مطالعہ کیا ہے اور ان کا ایک اجمالی جائزہ لیا ہے وہ بلا تامل اس حقیقت کو تسلیم کرے گا کہ اسلام نے علم و معرفت کو جو اہمیت و عظمت دی ہے اور اس کے حصول کے لیے جس تحریص و ترغیب سے کام لیا ہے کسی آسمانی یا غیر آسمانی مذہب نے اسے اتنی اہمیت و عظمت نہیں دی ہے۔

قرآن کریم کا ارشاد ہے:

"هَلْ يَسْتَوِي الَّذِينَ يَعْلَمُونَ وَالَّذِينَ لَا يَعْلَمُونَ"

(سورہ زمر آیت ۹)

"کیا وہ لوگ جو جانتے ہیں اور وہ لوگ جو نہیں جانتے برابر ہو سکتے ہیں؟"

قرآن کریم نے علم و دانش کے بلند مقام کی بڑے اعلیٰ ترین طریقے سے تعریف کی ہے۔

رسولِ اکرمؐ کا ارشاد ہے:

"طلب العلم فریضة علی کل مسلم"

"اطلبوا العلم من المهد الی اللحد"

"اطلبوا العلم ولو بالصین۔"

قرآن کریم نے اپنے ماننے والوں کو حکم دیا ہے کہ وہ کبھی بھی علم کے راستے سے نہ ہٹیں اور ظن اور شک کی پیروی نہ کریں اور ہر وہ بات یا خبر

جسے وہ سنیں یا دیکھیں یا ان کے ذہن میں آئے اسے بلا تامل قبول نہ کریں۔ کیونکہ اس صورت میں وہ ذمہ دار قرار دیئے جائیں گے۔

"وَلَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهِ عِلْمٌ إِنَّ السَّمْعَ وَالْبَصَرَ وَالْفُؤَادَ كُلُّ أُولَٰئِكَ كَانَ عَنْهُ مَسْئُولًا۔"

(سورہ اسرا آیت ۳۶)

"اس چیز کے پیچھے نہ چل جس کا تجھے علم نہ ہو کیونکہ کان اور آنکھ اور دل ان سب سے باز پرس ہوگی۔"

یہ بات واضح ہو چکی ہے کہ اسلام نے اپنے ماننے والوں کو ہدایت کی ہے کہ وہ اپنی تمام قوتوں اور وسائل کے ساتھ علم و دانش کے حصول کی کوشش کریں اور اس نے تفقہ فی الدین کو جو عقاید کی معرفت کا علم ہے اور احکامِ شریعت کے علم کو جو اسلامی قوانین کا علم ہے فرض قرار دیا ہے:

"وَمَا كَانَ الْمُؤْمِنُونَ لِيَنْفِرُوا كَافَّةً فَلَوْلَا نَفَرَ مِنْ كُلِّ فِرْقَةٍ مِنْهُمْ طَائِفَةٌ لِيَتَفَقَّهُوا فِي الدِّينِ وَلِيُنْذِرُوا قَوْمَهُمْ إِذَا رَجَعُوا إِلَيْهِمْ لَعَلَّهُمْ يَحْذَرُونَ"

(سورہ توبہ آیت ۱۲۲)

"یہ ضروری نہ تھا کہ تمام پیروانِ اسلام جہاد کے لیے باہر چلے جاتے۔ ان کی آبادی کے ہر حصے میں

سے کچھ لوگ نکل کر آتے اور دین کی سمجھ پیدا کرتے
اور واپس جا کر اپنے علاقے کے باشندوں کو خبردار
کرتے تاکہ وہ غیر اسلامی روش سے پرہیز کریں۔"

علمی حقائق اور حقیقی معارف کے سمجھنے کی صلاحیت تمام انسانوں میں یکساں نہیں ہوتی۔ کچھ لوگ ہوتے ہیں جو استدلالی فکر نہیں رکھتے اور سادہ ذہن کے ساتھ اپنے دائرہ کار میں مصروف رہتے ہیں اور مادی و دنیوی سطح پر زندگی گزارتے ہیں۔

ان کے برعکس کچھ دوسرے لوگ ہوتے ہیں جو استدلالی فکر رکھتے ہیں اور ان میں گہرے فکری مطالب اور نظریات کو سمجھنے کی فطری طور پر خاص صلاحیت ہوتی ہے۔

اسی طرح کچھ اور لوگ ہوتے ہیں جو فکر و عمل سے قطع نظر دنیائے مادی کے پُرفریب حسن اور اس کی لذتوں سے دلچسپی نہیں رکھتے۔ ان کا سارا میلان مادہ سے ماوراء دنیا کی جانب ہوتا ہے۔ وہ اس کے پائیدار اور بے پایاں حسن کے شیفتہ ہوتے ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ اس دنیا کی ساری زیبائیاں اس عالم آخرت کی ایک معمولی سی جھلک اور اس کا ایک چھوٹا سا عکس ہیں۔ ایسے لوگ اپنی باطنی روشنی کی مدد سے اس دوسری دنیا کے حقائق و اسرار کا ادراک کر لیتے ہیں۔

لوگوں کی ذہنی اور فکری صلاحیتوں میں اس نمایاں فرق کو ملحوظ رکھتے ہوئے اسلام تین مختلف انداز میں ان کی تربیت کرتا ہے اور ہر طبقے سے اس کی ذہنی سطح کے مطابق اور اس زبان میں بات کرتا ہے جو وہ سمجھ سکے۔"

ایک طبقے کی تعلیم و تربیت، اسلام دین کی کھلی اور ظاہر باتوں کے ذریعے کرتا ہے ——— اور دوسرے کی عمومی استدلال کے ذریعے، ——— اور ایک اور طبقے کی تربیت وہ جہادِ نفس اور تصفیۂ باطن کے ذریعے کرتا ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے ارشادات میں ایک مثال دی ہے۔ فرمانِ الٰہی ہے :

"اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَسَالَتْ
اَوْدِيَةٌ بِقَدَرِهَا"

(سورہ رعد آیت ۱۷)

"اللہ نے آسمان سے پانی برسایا اور ہر نہر و دریا
اپنے ظرف کے مطابق اسے لے کر چل نکلا۔"

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے :

"نحن معاشر الانبیاء امرنا ان
نکلم الناس علی قدر عقولھم"

"ہم پیغمبروں کے گروہ کو حکم دیا گیا ہے کہ ہم
لوگوں کی عقل و فہم کے مطابق ان سے بات کریں۔"

اسلام اپنے ماننے والوں میں سے ان لوگوں پر جو ذوق اور فہم و استدلال سے بہرہ مند نہیں ہیں اور اس راہ کے طے کرنے میں گمراہی اور کج روی کے خطرات سے دوچار ہو جاتے ہیں ان کی طاقت سے زیادہ ان پر بوجھ نہیں ڈالتا دین کے سہ گانہ اصولوں توحید، نبوت اور معاد کے ساتھ ساتھ امر و نہی کے سادہ بیانات کے ذریعے ان کی تعلیم و تربیت کرتا ہے۔ قرآن کریم کی بہت زیادہ آیات میں اس طرح کے بیانات اور رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور اوصیاءِ دین

کے ارشادات کی بہت سی روایات اور نصائح دینی میں اس طرح کی چیزیں موجود ہیں۔

اگرچہ کہ اصولِ سہ گانہ یعنی توحید، نبوت اور قیامت کے لیے انسانی فطرت کے مطابق آسانی سے استدلال کیا جا سکتا ہے لیکن انسان نے ان اصولوں کو علم قطعی کے طور پر قبول کر لیا ہے۔

اس طبقے نے اپنے اس رویے سے درحقیقت بقیہ اسلامی تعلیمات کو بھی بغیر استدلال کے قبول کر لیا ہے اور چونکہ نبوّت کی حقانیت کو قبول کر لیا ہے اس لیے جو کچھ بھی بذریعہ نبوّت آیا ہے اس کو درست اور قطعی قرار دیتا ہے۔

استدلال کی راہ:

جو لوگ پختہ ذہن رکھتے ہیں اور صحیح الفکر ہوتے ہیں اور علمی نظریوں کو اور عقلی و منطقی استدلال کو سمجھنے کی صلاحیت رکھتے ہیں اسلام ان کی تربیت عمومی استدلال کے ذریعے کرتا ہے یعنی وہ اس حقیقت کی جانب ان کی رہنمائی کرتا ہے جس کا وہ اپنی حقیقت پسند اور آلودگی سے پاک فطرت کی مدد سے ادراک کرتے ہیں۔ ایسا نہیں ہے کہ اسلام پہلے اپنے اعتقادات کو ان پر مسلط کرے اور ان کی تلقین کرے اور پھر ان کے دفاع میں دلیلیں تراشے اور بحث و حجت سے کام لے۔

کتاب و سنّت یعنی قرآن کی آیات، پیغمبرِ گرامی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور ائمہ ھدیٰ کے ارشادات جو قرآن کے مقاصد و مطالب کو بیان کرنے والے ہیں اس طرح کے استدلال سے بھرے ہوئے ہیں اور ان میں اسلامی عقائد

تفصیل سے سادہ ترین انداز میں اور قطعی دلیل و حجت کے ساتھ واضح کیے گئے ہیں اور ان ارشادات میں احکام و قوانین کی کلّی مصلحتیں اور عمومی منفعت بھی بتائی گئی ہے۔ تاہم اس نکتہ کو فراموش نہیں کرنا چاہیے کہ احکام و قوانین کی مصلحتوں اور منفعتوں کو زیر بحث لانے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ایک مسلمان فرد یا اسلامی معاشرہ جب تک احکام کی مصلحتوں اور منفعتوں کو نہ سمجھے انھیں قبول نہ کرے، وہ ایسا نہیں کر سکتا۔ کیونکہ جیسا کہ ہم نے پہلے ذکر کیا ہے یہ تمام احکام نبوت کے ذریعے ہم تک پہنچے ہیں اور نبوت کو ثابت کرنے کے جو دلائل ہیں وہی ان احکام کو ثابت کرنے کی اجمالی دلیلیں ہیں۔ خواہ ان کی کوئی تفصیلی دلیل میسر نہ ہو۔

اصولی طور پر کسی بھی معاشرہ میں خواہ وہ ترقی یافتہ ہو یا غیر ترقی یافتہ کسی قانون کے نفاذ کو ایک فرد کے نظریے کا لحاظ کر کے موقوف نہیں کیا جاتا۔ اور نہ اس قانون کے قبول کرنے یا رد کرنے میں فرد کو آزاد سمجھا جاتا ہے۔ اگرچہ کہ خود قانون کی رو سے فرد کو یہ آزادی حاصل ہوتی ہے کہ وہ فکری طور پر اس قانون کو تنقید کا ہدف بنائے۔ اگر ایسا نہ ہوا تو پھر معاشرہ ہی اپنے وجود سے محروم ہو جائے گا۔

بلاشبہ افراد قوانین کے بارے میں اپنی رائے کے اظہار میں آزاد ہوتے ہیں لیکن وہ کسی جاری و نافذ قانون کی عملی مخالفت کے لیے آزاد نہیں ہوتے۔ البتہ یہ ہو سکتا ہے کہ قانون بنانے والا ادارہ خود زیر بحث قانون کے منسوخ کرنے کا اعلان کرے[1]

---

[1] جو لوگ اسلام کے عملی احکام و قوانین کو اس کے اصلی منبع سے استنباط (باقی اگلے صفحہ پر)

اسی طرح مسئلہ تقلید کو اس عمومی دستور یعنی "عمل کا وجوب علم سے ہونا ہے" کے منافی نہ سمجھا جانا چاہیے۔ اور اسے متذکرہ بالا آیت "وَلَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهِ عِلْمٌ" کے خلاف نہیں سمجھنا چاہیے کیونکہ تقلید کی حقیقت یہ ہے کہ جب جاہل شخص اپنے فرض اور ذمہ داری کا تعین نہیں کر پاتا تو اسے کسی ایسے عالم کی پیروی کرنی چاہیے جو اس کی ذمہ داری کا تعین کر سکتا ہو۔ جاننے والے کی طرف رجوع کرنے کا اصول ایسے تمام مواقع پر نافذ ہوتا ہے جہاں انسان صحیح راہ کے تعین کی اہلیت نہ رکھتا ہو۔ یہ ایک مسلمہ اور معقول اصول ہے۔ اس اصول سے ہٹ کر تقلید ناپسندیدہ ہے۔ انسان بے چون وچرا ایک ایسے شخص کی تقلید اور پیروی شروع کر دے جس کی علمی صلاحیت کو اس نے نہ پرکھا ہو کسی طرح بھی پسندیدہ نہیں ہے۔

انسان اپنی حقیقت پسندی کی فطری صلاحیت کی بنا پر کوئی ایسی راہ اختیار نہیں کرتا جس سے وہ واقف نہ ہو۔ اگر ایسی کسی راہ پر اس کا جانا ضروری ہو تو وہ کسی ایسے شخص کی رہنمائی حاصل کرتا ہے جو اس راہ سے واقف ہو اور قدرتی طور پر اس کے علم وفہم کو پھر وہ اپنا علم وفہم قرار دیتا ہے۔

بیمار اگر خود معالج نہ ہو تو وہ کسی معالج سے رجوع کرتا ہے۔ انسان اپنی کسی بھی ضرورت کی تکمیل کے لیے اس شخص کی جانب رجوع کرنے پر مجبور ہے

(بقیہ حاشیہ گزشتہ سے پیوستہ) اور استخراج نہیں کر سکتے ان کو چاہیے کہ مجتہد کی طرف رجوع کریں مجتہد وہ شخص ہے جو قرآن وحدیث سے اسلام کے عملی احکام کو استنباط کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔

جو اس کی اس ضرورت کو پورا کرنے کی خاص صلاحیت اور علم رکھتا ہو، پھر وہ اسے اپنا رہنما اور رہبر بنا لیتا ہے۔ دنیا میں کوئی بھی شخص ایسا نہیں ہے جو ہر شعبے میں مہارت اور علم رکھتا ہو۔

تہذیب واصلاح کا ذریعہ:

جو لوگ اس دنیائے فانی کی پرفریب آرائشوں سے منہ پھیر لینے اور مادی روابط سے اپنے دل کا رشتہ توڑ لینے کی صلاحیت رکھتے ہیں اور اس ناپائدار دنیائے مادی کے ہر حُسن و قبح اور تلخ وشیریں اور ہر نشیب وفراز سے آنکھیں پھیر لینے اور اسے فراموش کرنے کے لیے آمادہ رہتے ہیں اور جنھوں نے اپنی چشم بصیرت کو صرف جہانِ ابدی کے لیے کھول رکھا ہے اور حق کی کبریائی اور اس کی عظمت کے انوار کا کسی مادی رکاوٹ کے بغیر ادراک کرتے ہیں اور جنھوں نے اس چند روزہ زندگی سے منہ پھیرنے کے بعد کمالِ انسانیت کے مدارج کو طے کیا ہے اور قربِ خداوندی کی بساط پر مسند نشین ہیں۔ ایسی منتخب وممتاز ہستیوں کے ساتھ اسلام درپردہ اس زبان میں بات کرتا جس زبان سے وہ آشنا ہیں اور اسے سمجھتے ہیں۔ انھیں اسلام سربستہ راز بتاتا ہے اور جہالت کی عمیق پستی سے لے کر معرفت کی عظیم بلندی تک ان کی رہنمائی اور رہبری کرتا ہے۔

کیا اسلامی عرفان ہندی عرفان سے لیا گیا ہے؟

بعض مستشرقین اور مفکرین نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ اسلامی عرفان و تصوف ہندی عرفان سے اخذ کیا گیا ہے۔ ورنہ اسلامی تہذیب بہت ہی سادہ

اور جامد اعتقادات اور خشک عبادات کے سوا اپنے دامن میں کچھ نہیں رکھتی۔ ان لوگوں کے جواب میں یہ مصرعہ پیش کیا جا سکتا ہے۔ ع

"سخن شناس نہ ای دلبرا، خطا اینجاست"

یہاں ہم ان لوگوں کے دعوے کا جواب دیتے ہوئے یہ نہیں چاہیں گے کہ اسلامی عرفان کے دفاع میں مصروف ہو کر مسلم عرفاء کی جو اپنے سلوک و طریقت کے سفر میں مختلف راہوں اور مراحل سے گزرتے رہے تصحیح کریں۔ یا ہندی عرفاء کے مقابل مسلمان عارفوں اور صوفیاء کی طریقت کو تقویت پہنچائیں۔ جیسا کہ طریقہ "استدلال" کے بارے میں ہم نے بحث کی ہے ہم نہیں چاہتے کہ مسلم فلاسفہ نے جو کچھ اپنی فلسفے کی کتابوں میں لکھا ہے اسے شروع سے لیکر آخر تک صحیح قرار دیں۔ جیسا کہ ہم نے دین کے ظاہری احکام کے بارے میں اس سے پہلے گفتگو کی ہے ہم نہیں چاہتے کہ عام مسلمان افراد کی روش کو خواہ وہ جو بھی ہو اور جس کسی کی بھی ہو بالکل صحیح اور درست قرار دیدیں۔

ہمارے اس مقالے کا مقصد اسلام کے اصل سرچشموں کتاب و سنّت کی روشنی میں ایک اجمالی جائزہ لینا ہے، بغیر اس کے کہ مثبت اور منفی طور پر مذکورہ طبقات میں سے ہر ایک کے قول و عمل کو زیر بحث لائیں۔

ان مفکرین نے جو دعویٰ کیا ہے اس کی بنیاد ارتقاء کا اصول ہے۔ انھوں نے اپنے علمی نظریات کو اسی بنیاد پر استوار کیا ہے اور وہ مظاہر فطرت میں رونما ہونے والی تمام تبدیلیوں اور تکمیل کے عمل کی توجیہ اسی اصولِ ارتقاء پر کرتے ہیں اور پھر اس اصول کو وہ تمام رونما ہونے والے واقعات حتیٰ کہ عادات و رسوم، جبلّی، فطری اور روحانی معاملات تک وسیع کر دیتے ہیں۔ اور وہ ہر رونما ہونے والے واقعہ کی جڑ کو سابقہ واقعات و حوادث میں تلاش کرتے ہیں۔ اپنے اسی نظریے کی بنیاد

پر انھوں نے یہ دعویٰ کیا ہے کہ اسلامی قوانین کا ماخذ روم کا قانون ہے اور اسلامی عقائد یونانی فلاسفہ کے افکار سے ماخوذ ہیں۔ اور بعض لوگوں نے اس سے آگے بڑھ کر یہ کہا ہے کہ دینی عقائد گزشتہ ادوار کے افکار کے ارتقاء کا نتیجہ ہیں۔

ان مفکرین نے دو اعتبارات سے غلطی کی ہے:

اوّل:۔

ہم جس چیز کو عرفانی اور الہامی ادراک کہتے ہیں انھوں نے اسے عام نوعیت کی فکر قرار دیا ہے اور نتیجتاً اہلِ باطن کے اپنے تصفیے اور تزکیے کے علم کو انھوں نے ایک شاعرانہ فکر سے تعبیر کیا ہے۔ ایک شاعر اپنے ذوقِ سرشار اور شیریں زبانی کی ورد سے اس طرح کے افکار کو ایک عالمِ ربّانی کی بہ نسبت زیادہ بہتر انداز میں پیش کر سکتا ہے۔ ان مفکرین نے وحیِ الٰہی اور انبیاء کی آسمانی فکر کو بھی جو معارفِ الٰہی اور قوانینِ اسلامی کا ذریعہ ہے اسی پر قیاس کرنے کی غلطی کی ہے۔ نتیجتاً ان مفکرین نے اسلامی عقاید اور قوانین کو یونانی افکار اور رومی قوانین سے ماخوذ قرار دیا ہے۔ یہ بات ان مباحث سے بخوبی ظاہر ہے جو ان مفکرین نے نبوت اور انبیاء کے طرزِ فکر کے بارے میں کی ہے۔

انبیاء کے بارے میں ان مفکرین کے جو بیانات ہمارے سامنے ہیں ان کی بنا پر ہم یہ کہیں گے کہ قطع نظر اس سے کہ یہ مفکرین اپنے دعوے میں سچے ہوں یا جھوٹے ان کا یہ نظریہ واضح طور پر غلط قرار پاتا ہے۔

دوّم:۔

دوسری بات یہ کہ بالفرض اگر ارتقاء کے اصول کو ایک ثابت شدہ

اور مسلّمہ اصول تسلیم کر لیا جائے تب بھی انواعِ مخلوقات میں سے ہر نوع کی اپنی جبلّت کا جو اصول ہے اسے ارتقا کے اس اصول کے ساتھ نہیں جوڑنا چاہیئے۔ فطرت کے مطابق ہر نوعِ مخلوق کی سرشت میں جو جبلّت پوشیدہ ہے اس نوع کے کسی بھی فرد سے اگر کوئی خارجی رکاوٹ موجود نہ ہو تو وہ پوشیدہ جبلّت ضرور ظاہر ہو کر رہے گی۔ خواہ ماضی میں اس کے سلسلے کی کوئی کڑی موجود ہو یا نہ ہو۔

مثلاً یہ کہا جا سکتا ہے کہ غذاؤں میں تنوّع اور رنگارنگ اور غذاؤں کی تیاری کا فن عربوں نے عجم سے حاصل کیا ہے لیکن یہ نہیں کہا جا سکتا کہ کھانے اور غذا کو چبانے کا سبق بھی عربوں نے عجمیوں سے پڑھا ہے۔

یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ جمہوری طرزِ حکومت اور اس کے مختلف اداروں کی تشکیل کا عمل مشرق نے مغرب سے لیا ہے لیکن یہی بات معاشرہ کی تشکیل اور حکومت کے قیام کے بنیادی عمل کے بارے میں نہیں کہی جا سکتی۔

ہماری گزشتہ بحث سے یہ بات واضح ہو چکی ہے کہ تزکیے و تصفیے کو اور معنوی زندگی اور عرفانی و روحانی ذوق کو ایک ایسی جبلّت کی حیثیت حاصل ہے جو انسان کی سرشت میں پوشیدہ ہے۔ انسان جب ضروری استعداد حاصل کر لیتا ہے اور تمام رکاوٹیں دور ہو جاتی ہیں تو یہ جبلّت بیدار ہو کر اسے تزکیے و تصفیے کی راہ پر گامزن کر دیتی ہے۔

جو مذاہب و ادیان حیات بعد الموت کے عقیدے سے کم و بیش تعلق رکھتے ہیں ان کے ماننے والوں میں قدرتی طور پر ایسے لوگ پیدا ہوتے ہیں جن میں معنوی زندگی کی جبلّت بیدار ہو جاتی ہے اور وہ اس مصیبتوں اور دکھوں سے بھری ہوئی فانی دنیا سے منہ موڑ کر ایک ابدی آرام و سکون کی تلاش میں عالمِ آخرت کی جانب

متوجہ ہو جاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہر اس دین و مذہب کے ماننے والوں میں جو خدا کا عقیدہ رکھتے ہیں معنوی زندگی اور عرفانی و روحانی طریقے پر چلنے والا کوئی نہ کوئی گروہ موجود ہوتا ہے۔

مختلف مذاہب و ادیان کی اصل تعلیمات میں موجود معنویات اور روحانیات کا جب ہم موازنہ کرتے ہیں تو ہم پر بخوبی آشکار ہوتا ہے کہ اسلام کی اصل تعلیمات نے ہر دوسرے مذہبی آئین سے زیادہ انسان کی ابدی کامیابی اور عالمِ آخرت پر زور دیا ہے۔

اس لیے اسلام میں تہذیب و تصفیہ کا طریقہ ہندوستان یا کسی اور جگہ سے تعلق رکھے بغیر فطری اور صرف اسلامی ہی ہو گا۔

تاریخ سے یہ بات ثابت ہے کہ امیر المومنین علی ابن ابی طالب علیہ السلام کے اصحاب میں سے بعض اصحاب جیسے سلمان، رشید اور میثم اور اویسؒ جناب امیر المومنینؑ سے تعلیم و تربیت حاصل کر کے معنوی و روحانی زندگی سے بہرہ مند رہے ہیں۔ ابھی مسلمانوں کے قدم ہندوستان کے ساحل تک نہیں پہنچے تھے اور ہندی باشندوں کے ساتھ ان کا میل جول ابھی شروع نہیں ہوا تھا کہ تصوّف کے مختلف سلسلوں کا اسی وقت آغاز ہو چکا تھا۔ خواہ "تصوّف کے یہ سلسلے غلط ہوں یا صحیح" ان میں سے ہر ایک اپنا تعلق حضرت علیؑ سے ہی جوڑتا ہے اور ان سے وابستگی کا دعویدار ہے۔ خود یہ بات ہمارے نقطۂ نظر کو صحیح اور مسلّمہ قرار دیتی ہے۔

اسلام کے عرفانی بیان کا دوسروں سے فرق

جب ہم اسلام کی دقیق تعلیمات کا دوسرے مذاہب کی تعلیمات خصوصاً

ہندی روحانی فلسفے اور مذہبی تعلیمات کے ساتھ موازنہ کرتے ہیں تو ہمیں ایک فرق واضح طور پر نظر آتا ہے۔ اسلام نے روحانی اور عرفانی حقائق کا اظہار اپنے عمومی بیانات کے اندر رکھ کر کیا ہے تاکہ لوگوں کے تمام طبقات اپنے فہم و ادراک کے مطابق ان حقائق سے بہرہ مند ہوں۔ اسی لیے اسلام نے حقائق کی ہر طرح کی پردہ دری سے احتراز کیا ہے۔ لیکن دوسرے مذاہب کی تعلیمات کو یہ امتیاز حاصل نہیں ہے اسی لیے اسلام ان نقصان دہ نتائج سے محفوظ رہا ہے جو دوسرے مذاہب کی تعلیمات نے حقائق کی پردہ دری کی بنا پر اٹھائے ہیں۔

اگر ہم ہندی روحانی فلسفے کا جائزہ لیں اور ہندوؤں کی مقدس کتاب وید کی اوپنشدوں (اس کے معارفِ الٰہی کے حصّے) کا مطالعہ کریں۔ اور اس کے مضامین کے آغاز و انجام کو الٹ پلٹ کر دیکھیں اور اس کی ہر بات کا اس کے تمام امثال و نظائر کے ساتھ جائزہ لیں اور اس کی توجیہ کریں تو ہمیں معلوم ہوگا کہ ان کا مقصد ایک بہت ہی دقیق اور عمیق توحید کے سِوا کچھ نہیں ہے۔ لیکن ان اوپنشدوں میں سیدھی اور پائیدار باتوں کو اس قدر پردہ دری کے ساتھ اور بے حجابانہ بیان کیا گیا ہے کہ ہر ایسا شخص جو عرفانی اور روحانی مطالب سے پوری طرح واقف نہ ہو ان کی نازک اور باریک باتوں کو خرافات کا پلندہ سمجھنے لگتا ہے اور ان کے ایسے بیانات سے جن میں توحیدِ حق کو بڑی نفاست و نزاکت کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ سوائے حلول، اتحاد اور بت پرستانہ افکار کے اسے کچھ سمجھ میں نہیں آئے گا۔

ہماری اس بات کے صحیح ہونے کے گواہ ان مستشرقین کے بیانات و نظریات ہیں جو سنسکرت، ہندی گیان اور ہندی روحانی فلسفے کے ماہر ہیں۔ انھوں نے برہمن مذہب اور بدھ مذہب کی اصل تعلیمات کے مطالعہ اور تحقیق کے بعد ہندی روحانی فلسفہ کو فضول اور بیہودہ افکار کا ایک پلندہ قرار دیا ہے۔ ان کے نزدیک ہندی ذہن زندگی کی خوبیوں سے محروم ہے۔

ہندی روحانیات کے بارے میں ان آرار کا اصل سبب ہندی تعلیمات میں وہ بے باکانہ اندازِ بیان ہے جو حقائق کی پردہ دری کے لیے اختیار کیا گیا ہے۔[۱]

ہندی روحانیات کے فاسد نتائج

ہندی عرفان یا روحانیات کو اپنے نامناسب انداز کی بنا پر تین طرح کے نقصانات کا سامنا کرنا پڑا ہے:

(۱) —— ہندی عرفان یا روحانیات کا مقصد خدائے پاک کی خالص توحید کے سوا اور کچھ نہیں تھا لیکن جب اس نے اپنے ماننے والوں کو سمجھانے کا کام شروع کیا تو وہ ٹھیک اپنی مخالف سمت پر پہنچ گیا اور بت پرستی میں تبدیل ہو گیا اور خدائے واحد کی بجائے لوگوں کی خواہشات نے کئی خدا تراش لیے اور ان کی پرستش کی جانے لگی۔ فرشتے، جن، پری اور مقدس انسان سب کو معبود بنا لیا گیا۔

---

[۱] جیسا کہ ممتاز مستشرق هرمان الدنبورک نے اپنی اس کتاب میں صریحًا کہا ہے جو اس نے بودھ کی رہبانیت اور طریقے کی شرح میں لکھی ہے۔ وہ لکھتا ہے: "ہندوؤں کے عرفانی اور روحانی افکار ایسے تصورات ہیں جو حماقت سے بھرے ہوئے ہیں۔ بودھ دنیا کو خدا سے بے نیاز ایک مستقل وجود قرار دیتا ہے" کتاب "فروغ خاور" هرمان الدنبورک کی کتاب "بودھ کی رہبانیت اور طریقے" کا ترجمہ۔

مجوسی عرفان یا مجوسی روحانی فلسفہ جو اس مذہب کی تعلیمات سے نکلا ہے وہ بھی اسی انجام سے دوچار ہوا۔ حالانکہ اس کے ماننے والوں میں بت تراشی و بت پرستی کا معمول نہیں تھا۔ فرشتوں، مقدّس انسانوں اور عناصر کی تقدیس نے ان کو بھی اسی راہ پر ڈال دیا۔ ان میں آتش پرستی کا رواج ہندی بت پرستی کے طریقے ہی کی طرح ہے۔

مسیحی عرفان و تصوّف جس کا سب سے پہلا نمونہ یوحنّا کی انجیل میں ظاہر ہوا۔ اپنے عملی مراحل میں اس نے اسی ہندی روحانی فلسفے کی صورت اختیار کر لی مسیحیت میں تثلیث دراصل وہی بت پرستی کی تثلیث ہے[1]

(۲) —— ہندی روحانیت اپنے ماننے والوں کو جو ہدایات دیتی ہے وہ منفی نوعیت کی ہیں اور ان کے نتیجے میں تخلیقِ الٰہی کا وہ سارا مثبت عمل جو عالمِ انسانیت میں جاری ہوا ہے وہ انسان کی معنوی اور روحانی زندگی سے بالکل بے تعلق ہو کر رہ جاتا ہے جبکہ اللہ تعالیٰ نے ہر انسان کو اپنی قدرتِ کاملہ کی نشانی اور اپنی عظیم صفات میں سے ایک صفت کا آئینہ بنایا ہے۔ ہندی عرفان یا روحانی فلسفہ کا یہ ایک بڑا نقص ہے جو اس کا ایک لازمی جز بن چکا ہے۔ مجوسی اور مسیحی تصوّف بھی اسی نقص اور خرابی کا شکار ہے

۱ے کتاب "العقائد الوثنیہ فی الملۃ النصرانیہ" سے رجوع کیا جائے۔

یہ صرف اسلام ہی ہے جس نے اپنی معنوی و روحانی زندگی کو پورے عالمِ انسانیت اور اس میں رونما ہونے والے مثبت و منفی تمام مظاہر تک وسیع کر دیا ہے۔

(۳) —— ہندی روحانی فلسفہ لوگوں کے بعض طبقوں کو جیسے عورتوں کا طبقہ اور مردوں کے بھی ایک طبقے کو، معنوی اور روحانی زندگی سے محروم کر دیتا ہے۔ اسی طرح مسیحیت میں عورتیں معنوی اور روحانی زندگی سے محروم کر دی گئی ہیں۔ یہ تنہا اسلام ہے جو کسی بھی فرد کو معنوی زندگی سے محروم نہیں کرتا اور وہ ہر شخص کی اس کی حالت و کیفیت کے مطابق تعلیم و تربیت کرتا ہے۔

اسلام کا طریقہ

جس طرح فطرتِ الٰہی نے زندگی کے تمام مخصوص مادی وسائل کو انسانی دسترس میں قرار دیا ہے اور سب انسانوں کو مساوی طور پر ان مادی وسائل سے سنوارا ہے اور انسانوں کے مابین کسی قسم کا فرق روا نہیں رکھا ہے اسی طرح مادی زندگی سے ماوراء معنوی زندگی کو بھی تمام انسانوں کی دسترس میں قرار دیا ہے اور جس طرح انسان کی مادّی زندگی کا عروج و زوال اس کے مثبت و منفی فکر و عمل کا عکس اور پرتو ہیں اسی طرح معنوی زندگی کے عروج و زوال کو اس کے مثبت و منفی افکار و اعمال تک وسعت دی ہے۔

تخلیقِ الٰہی نے معنوی زندگی کے ساتھ ارتباط اور ہم آہنگی کو تمام افراد کا حق قرار دیا ہے اور کسی طبقے کے درمیان فرق و امتیاز سے کام نہیں لیا ہے اور

معنوی و روحانی زندگی کو حیاتِ انسانی کے تمام مثبت اور منفی گوشوں تک وسیع کر دیا ہے اور انسان کو اجتماعی زندگی اختیار کرنے اور ایک مقررہ راہ راست پر چل کر مثبت جدوجہد کرنے کی دعوت دی ہے اور انسان کو اس طریقے و روش کی تعلیم دینے کے لیے ان اشارات سے کام لیا ہے جو اس کے عمومی اور کلی نوعیت کے بیانات میں پوشیدہ ہیں۔ کیونکہ ہمارے لفظی بیانات خواہ وہ کچھ بھی ہوں ان سے عمومی افکار پیدا ہوتے ہیں۔ جن سے ہم اپنی مادی و اجتماعی زندگی میں باہمی افہام و تفہیم کے لیے استفادہ کرتے ہیں اور اپنے ذہنی تصوّرات اور خیالات کو ان کے ذریعہ دوسروں تک پہنچاتے ہیں۔

ذوقی اور شہودی ادراکات جو اکسیر سے بھی زیادہ نایاب ہیں اور جنہیں کبھی تاریخِ انسانیت میں عمومیت حاصل نہیں ہو سکی ہے۔ ان پر یہاں گفتگو کرنے کا موقع نہیں ہے اگر کوئی شخص ادراکِ ذوقی سے حاصل ہونے والی معلومات کو تصوّر و خیال کی راہ سے بیان کرنا چاہتا ہے تو اس کی مثال اس شخص کی سی ہے جو کسی مادر زاد اندھے کو قسم قسم کے رنگوں کی کیفیت اس کی قوت سامعہ کے ذریعہ سے سمجھانے کی کوشش کرے اور جو شخص ادراکِ شہودی سے حاصل ہونے والے معانی و مطالب کو الفاظ کا جامہ پہنانے کی کوشش کرے۔ اس کی مثال اس شخص کی ہے جو پانی کو چھلنی کے ذریعہ ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جانے کی کوشش کرے۔

سیرِ معنوی کی کچھ تفصیل

ممکن ہے کہ ہمارے اس دعوے کو کہ اسلام نے "راہِ باطن" کو رموز اور اشارات میں بیان کیا ہے ایک بے دلیل دعویٰ سمجھا جائے۔ ایسا سمجھنا درحقیقت اندھیرے میں تیر پھینکنے کے مترادف ہے۔ اسلامی ارشادات و تعلیمات کا جب

بغور مطالعہ کیا جائے اور معنوی زندگی کے اس شیفتہ و شوریدہ طبقہ کے حال کو سامنے رکھ کر اُن کا جائزہ لیا جائے تو لوگوں کے اس خیال کے خلاف بات ثابت ہوتی ہے۔ معنویت کی راہ پر چلنے والے جو مراحلِ کمال طے کرتے ہیں ان سے بھی ہمارے اس دعوے کا مجموعی اور کلّی طور پر ثبوت ملتا ہے۔

اس طبقہ سے تعلق رکھنے والے لوگ اپنی فطری استعداد کی بنا پر حق کے ابدی جمال و کمال کے شیدا و شیفتہ ہوتے ہیں۔ وہ مہر و محبت کے طریقے پر اللہ کی پرستش کرتے ہیں۔ وہ اس کی عبادت ثواب کی امید اور عذاب کے خوف سے نہیں کرتے کیونکہ بہشت کی امید و طلب اور دوزخ کے خوف و خطر کی بنا پر خدا کی عبادت و پرستش کرنا دراصل اسی عذاب و ثواب کی پرستش کرنا ہے نہ کہ خدا کی پرستش کرنا۔

یہ لوگ مہر و محبت کے گہرے جذبے کے تحت جو ان کے دلوں پر چھا جاتا ہے اور خصوصاً ان ارشاداتِ الٰہی کے سننے کے بعد ہر حال میں یادِ خدا میں مصروف رہتے ہیں:

"فَاذْكُرُونِي أَذْكُرْكُمْ"

(سورۂ بقرہ آیت ۱۵۲)

"مجھے یاد کرو میں تمہیں یاد کروں گا"

اسی طرح کی سینکڑوں آیتیں جن میں اللہ کے ذکر اور اس کی یاد کے بارے میں کہا گیا ہے جیسے:

"الَّذِينَ يَذْكُرُونَ اللَّهَ قِيَامًا وَقُعُودًا وَعَلَىٰ جُنُوبِهِمْ"

(سورہ آل عمران آیت ۱۹۱)

"جو ہر حال میں قیام و قعود میں اور جب وہ اپنے

پہلوؤں پر آرام کر رہے ہوں، اللہ کو یاد کرتے رہتے ہیں۔"

اور جب وہ محبوبِ حقیقی کے اس پیغام کو سنتے ہیں:

"اِنَّ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ لَاٰیٰتٍ لِّلْمُؤْمِنِیْنَ۔"

(سورہ جاثیہ آیت ۳)

"آسمان اور زمین میں مومنین کے لیے نشانیاں ہیں"

"وَاِنْ مِّنْ شَیْءٍ اِلَّا یُسَبِّحُ بِحَمْدِہٖ"

(سورہ اسرا آیت ۴۴)

"کوئی چیز ایسی نہیں ہے جو اللہ تعالیٰ کی تسبیح و حمد میں مصروف نہ ہو"

"فَاَیْنَمَا تُوَلُّوْا فَثَمَّ وَجْہُ اللہِ"

(سورہ بقرہ آیت ۱۱۵)

"تم جس طرف بھی رخ کرو اس طرف اللہ کا چہرہ ہے"

ان آیات کو سن کر وہ جان لیتے ہیں کہ دنیا کی تمام موجودات دراصل آئینے ہیں جن میں سے ہر ایک اپنے وجود کی مناسبت سے حق کے بے مثال جمال کو منعکس کرتا ہے اور اس کا نشان دیتا ہے۔ وہ ایک آئینے کے سوا کچھ نہیں ہیں اور وہ اپنا کوئی مستقل بالذات وجود نہیں رکھتے۔ اسی لیے وہ ہر چیز کو مہر و محبت کے ساتھ دیکھتے ہیں اور جمالِ دوست کے نظارے کے سوا ان کا کوئی مقصد نہیں ہوتا۔

اور جب وہ اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کو سنتے ہیں:

"یٰاَیُّہَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا عَلَیْکُمْ اَنْفُسَکُمْ لَا یَضُرُّکُمْ مَّنْ ضَلَّ اِذَا اہْتَدَیْتُمْ۔" (سورہ مائدہ آیت ۱۰۵)

"یٰاَیُّہَا الْاِنْسَانُ اِنَّکَ کَادِحٌ اِلٰی رَبِّکَ کَدْحًا فَمُلٰقِیْہِ۔"

(سورہ انشقاق آیت ۶)

"اے ایمان والو اپنے نفس کی فکر کرو جب کہ تم ہدایت پاچکے ہو۔ گمراہ لوگ تمھیں کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتے۔"

"اے انسان بلاشبہ تو اپنے خدا کی طرف بڑھ رہا ہے پس اس سے تیری ملاقات ہوگی۔"

اللہ تعالیٰ کے ان ارشادات کو سن کر وہ جان لیتے ہیں کہ وہ تخلیقِ الٰہی کے مطابق اپنے نفس کی چار دیواری میں مقیّد ہیں اور اپنے خدا تک پہنچنے کے لیے نفس کے تزکیے اور تصفیے کے سوا اور کوئی راہ نہیں ہے اور وہ اس وسیع دنیا میں جو کچھ دیکھتے ہیں یا پاتے ہیں اسے خود اپنے آئینۂ ذات میں دیکھتے ہیں اور پاتے ہیں۔ وہ اس مرحلے اور مقام پر ہیں جہاں پہنچ کر انسان یہ سمجھنے لگتا ہے کہ وہ ہر جگہ اور ہر چیز سے منقطع ہے اور سوائے اس کے اور اس کے خدا کے کوئی نہیں ہے۔ ایسا شخص اگر لاکھوں آدمیوں کے درمیان بھی ہو تو خود کو تنہا محسوس کرتا ہے دوسرے تو اسے ایک انجمن کے درمیان دیکھتے ہیں لیکن وہ خود کو ایک ایسی خلوت میں پاتا ہے جہاں غیر اللہ کا کوئی وجود نہ ہو۔

اس خلوت سے خدا کے سوا کسی اور جانب کوئی راستہ نہیں جاتا۔ اس مقام پر پہنچ کر وہ اپنے آئینۂ ذات میں دیکھتا ہے اور تمام چیزوں کا اپنی ذات میں مشاہدہ کرتا ہے اور خود کو بجز ایک ایسے آئینے کے اور کچھ نہیں سمجھتا جس میں حق تعالیٰ کا جمال ظاہر ہو۔ یعنی اس کی نگاہوں میں خدا کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا۔

اپنی اس حالت و کیفیت کے ساتھ جب وہ یادِ خدا میں مصروف ہوتا ہے

اور مختلف عبادات کو انجام دیتا ہے اور ان عبادات کے ذریعہ گوناگوں توجہات کی تکمیل کرتا ہے اور خدا کی یاد کو جو ہر طرح کی آلودگی سے پاک اور بالکل خالص ہو اپنے دل میں جما لیتا ہے تو پھر اسے اہلِ یقین کی صف میں جگہ مل جاتی ہے اور اللہ تعالیٰ کا یہ وعدہ اس کے حق میں پورا ہو جاتا ہے:

"وَاعْبُدْ رَبَّكَ حَتّٰى يَأْتِيَكَ الْيَقِيْنُ."

(سورہ حجر آیت ۹۹)

"اپنے خدا کی عبادت کر یہاں تک کہ تجھے یقین حاصل ہو جائے۔"

یہ وہ مرحلہ و مقام ہے جہاں پہنچنے کے بعد آسمان و زمین کے ملکوت کے دروازے اس پر کھل جاتے ہیں اور وہ ہر چیز کو خدا کی ملکیت اور بلا شرکتِ غیرے اسی کی ملکیت میں دیکھنے لگتا ہے۔ جیسا کہ قرآن ابراہیمؑ کے متعلق فرماتا ہے:

"وَكَذٰلِكَ نُرِيْٓ اِبْرٰهِيْمَ مَلَكُوْتَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَلِيَكُوْنَ مِنَ الْمُوْقِنِيْنَ."

(سورۂ انعام آیت ۷۵)

"اس طرح ہم ابراہیم کو آسمان اور زمین کی ملکوت کا مشاہدہ کراتے ہیں تاکہ وہ یقین کرنے والوں میں شامل ہو جائے۔"

پہلے اس پر توحیدِ افعالی منکشف ہوتی ہے اور وہ اپنی آنکھوں سے دیکھے گا کہ یہ خدا ہی ہے۔ دنیا کو اور جو کچھ دنیا میں ہے اسے گردش و حرکت میں لا رہا ہے اور وہ مشاہدہ کرتا ہے کہ کائنات کے مختلف اسباب و عوامل طرح طرح کے کام انجام دے رہے ہیں اور ان کی اختیاری حرکات ان کی صفتِ اختیار کے

ساتھ جاری ہیں اور ان کی اضطراری حرکات ان کی صفتِ اضطرار کے ساتھ انجام پا رہی ہیں اور ان کے یہ سارے اعمال و حرکات ایک قادر و توانا ہستی کے دستِ قدرت کا نتیجہ ہیں۔

اگر علت و معلول ہے اور علت و معلول کے درمیان کوئی رابطہ ہے تو یہ سارا سلسلہ اسی کا قائم کیا ہوا اور بنایا ہوا ہے۔

"وَلِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ."

(سورہ جاثیہ آیت ۲۷)

"آسمان اور زمین میں جو کچھ ہے وہ اللہ ہی کا ہے۔"

پھر اس پر توحیدِ اسماء و صفات منکشف ہوگی اور وہ اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کرے گا کہ اس کی ہر صفتِ کمال جس کا اس وسیع دنیا میں ظہور ہوتا ہے اور اس کا ہر جمال و جلال جو دکھائی دیتا ہے خواہ اس کا تعلق حیات سے ہو، علم سے ہو، قدرت، عزت اور عظمت یا کسی اور بات سے ہو۔ وہ حق کے بے پایاں نور کے سرچشمے سے نکلنے والی شعاعوں میں سے ایک شعاع ہے یہ شعاعیں وجودِ اشیاء کے مختلف دریچوں سے نکل کر اپنے گوناگوں اختلاف کے ساتھ چمکتی ہیں:

"وَلِلّٰهِ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى."

(سورۂ اعراف آیت ۱۸۰)

"اور تمام اچھے نام اللہ کے لیے ہیں۔"

پھر تیسرے مرحلے میں وہ مشاہدہ کرے گا کہ تمام گوناگوں صفات ایک بے نہایت ذات کے جلوے ہیں اور حقیقت میں سب عین بھی ہیں اور سب عین ذات بھی:

"قُلِ اللّٰهُ خَالِقُ كُلِّ شَيْءٍ وَّهُوَ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ۔"

(سورۂ رعد آیت ۱۶)

"کہہ دو اللہ ہر چیز کا پیدا کرنے والا ہے وہ واحد یکتا ہے اور (ہر چیز پر) غالب ہے۔"

توحید کے بارے میں اسلام کی برتری

توحید کے یہ تین مراحل ہیں جو حق کی راہ پر چلنے والوں کے حصے میں آتے ہیں اور مختلف ادیان و مذاہب کے ماننے والے حق اور حقیقت کے شیدا لوگ جو صرف اپنے خدا سے سروکار رکھتے ہیں وہ جب اس راہ پر گامزن ہوتے ہیں تو اسی کو اپنا آخری ہدف قرار دیتے ہیں۔ لیکن اسلام اپنے تربیت یافتہ راہ روؤں کی ترقی کے لیے اس بلندی کی طرف رہنمائی کرتا ہے جہاں تک دوسرے مذاہب کے ماننے والے نہیں پہنچ سکے اور اپنی اس سب سے بڑی بلندی کو اپنے ماننے والوں کا آخری ہدف قرار دیتا ہے۔

برہمنوں، بودھ کے ماننے والوں، صابئیت اور مسیحیت کے پیروؤں کی اصل تعلیمات سے جو کچھ معلوم ہوتا ہے وہ یہی ہے کہ انھوں نے مان لیا ہے کہ خدا محدود نہیں ہے وہ اسے ہر اسم و رسم سے بالاتر ایک لامتناہی حقیقت سمجھتے ہیں لیکن اسلام نے لامتناہی ہونے کی (اس لیے کہ وہ صفت ہے اور صفت خواہ کوئی بھی ہو محدودیت سے خالی نہیں ہوتی) صفت کے اعتبار سے نفی کی ہے۔ وہ اللہ کی مقدس ذات کو ہر اسم و رسم سے حتیٰ کہ اس لامتناہی ہونے کی صفت سے بھی بالاتر قرار دیتا ہے۔ اور توحید کا یہ وہ مقام و مرحلہ ہے جو سوائے

اسلام کے دینِ مقدس کے اور کہیں نہیں ملتا۔

کتاب کافی میں امام ششم ؑ سے جو روایت نقل کی گئی ہے اس کے مطابق توحید کے اس مقام و مرحلے کو اس آیۂ کریمہ سے لیا گیا ہے:

"قُلِ ادْعُوا اللّٰهَ اَوِ ادْعُوا الرَّحْمٰنَ اَيًّا مَّا تَدْعُوْا فَلَهُ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى"

(سورہ اسرا آیت ۱۱۰)

"اے نبیؐ ان سے کہو اللہ کہہ کر پکارو یا رحمٰن کہہ کر جس نام سے بھی پکارو اس کے لیے سب اچھے ہی نام ہیں۔"

اب تک ہم نے اس مقالے میں جو بحث کی ہے اس کی سطح سے اس بحث کی سطح بلند ہے۔ اس لیے ہم اس سلسلے کو یہیں ختم کرتے ہیں۔

ولایتِ الٰہی

راہِ کمال کے رہرو اپنے نقطۂ آغاز سے لے کر اس مقام تک جہاں پہنچ کر وہ رک جاتے ہیں بہت سے مشاہدات سے بہرہ مند ہوتے ہیں۔ جہانِ مادّہ کے خاک نشینوں کے دیدہ و دل سے، ان کے یہ مشاہدات پوشیدہ رہتے ہیں۔ ان کو زیرِ بحث لانا اس مقالے کی حدود سے باہر ہے۔ اس مقام پر جس چیز کا یاد دلانا اہمیت رکھتا ہے، وہ ولایتِ الٰہی کا مسئلہ ہے

یہ رہرو جب توحید کے مرحلے میں داخل ہوتے ہیں اور قربِ خداوندی کی بساط پر قدم رکھتے ہیں تو اس وقت تک جو کچھ وہ اپنے پاس رکھتے تھے اور اسے اپنی ملکیت سمجھتے تھے اور اس کے منتقل ہونے کا دعویٰ کرتے تھے اس سے

یکسر دست بردار ہو جاتے ہیں اور اسے خدا کی ملکیت سمجھنے لگتے ہیں اور اپنے ملکیت کے جھوٹے دعوے کو ترک کر دیتے ہیں۔

یہ وہ وقت اور موقع ہوتا ہے جب انھیں بڑی راحت میسر آتی ہے اور رنج و تکلیف سے بالکلیہ آزاد ہو جاتے ہیں۔ اور ہر خوف اور ہر رنج سے چھٹکارا حاصل کر لیتے ہیں کیونکہ جس چیز کے وہ مالک نہیں ہیں تو پھر اس کے نقصان سے وہ کیوں ڈریں یا اگر اسے کوئی نقصان پہنچا ہے تو اس کے لیے رنجیدہ کیوں ہوں؟

"اِنَّ الَّذِیْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰہُ ثُمَّ
اسْتَقَامُوْا تَتَنَزَّلُ عَلَیْہِمُ الْمَلٰٓئِکَۃُ
اَلَّا تَخَافُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَبْشِرُوْا بِالْجَنَّۃِ
الَّتِیْ کُنْتُمْ تُوْعَدُوْنَ ○ نَحْنُ
اَوْلِیٰٓؤُکُمْ فِی الْحَیٰوۃِ الدُّنْیَا وَفِی الْاٰخِرَۃِ ج

(سورہ فصلت آیات ۳۰-۳۱)

"اَلَآ اِنَّ اَوْلِیَآءَ اللّٰہِ لَا خَوْفٌ عَلَیْہِمْ
وَلَا ہُمْ یَحْزَنُوْنَ۔

(سورہ یونس آیت ۶۲)

"وہ کہ جنھوں نے کہا۔ ہمارا رب اللہ ہے، پھر
انھوں نے اس پر استقامت اختیار کی۔ ان پر
فرشتے نازل ہوتے ہیں کہ نہ ڈرو اور نہ رنجیدہ ہو
اور خوش ہو جاؤ اس جنت کی خوشخبری سے
جس کا تم سے وعدہ کیا گیا ہے۔ ہم دنیا اور
آخرت میں تمھارے سرپرست اور ولی ہیں۔"

"آگاہ رہو خدا کے دوستوں کے لیے خوف نہیں ہے
اور نہ وہ غمگین ہوتے ہیں۔"

یہ وہ مرحلہ ہے جس میں تلخ و شیریں، بدصورتی و خوبصورتی اور دنیا کے نشیب و فراز ان کی نظر میں یکساں قرار پاتے ہیں۔ انھیں ایک دوسری زندگی مل جاتی ہے۔ دنیا اور جو کچھ دنیا میں ہے وہ اسے ایک دوسری نظر سے دیکھنے لگتے ہیں:-

"اَوَمَنْ کَانَ مَیْتًا فَاَحْیَیْنٰہُ وَجَعَلْنَا
لَہٗ نُوْرًا یَّمْشِیْ بِہٖ فِی النَّاسِ کَمَنْ
مَّثَلُہٗ فِی الظُّلُمٰتِ"

(سورہ انعام آیت ۱۲۳)

"کیا وہ شخص کہ جو مردہ تھا جسے ہم نے زندہ کیا
اور اس کے لیے ایک نور فراہم کیا جسے لے کر وہ
لوگوں کے درمیان چلتا ہے۔ کیا وہ ایسے شخص کی
مانند ہو سکتا ہے جو تاریکیوں میں ہو۔"

آخر کار وہ خود اور جو کچھ ان کے پاس ہوتا ہے وہ خدا کا ہو جاتا ہے اور خدا ان کا ہو جاتا ہے۔

مَن کانَ لِلّٰہ کانَ اللّٰہُ لَہٗ

گزشتہ مباحث سے یہ بات اچھی طرح واضح ہو چکی ہے کہ دوسرے ادیان اور مذاہب کی بہ نسبت اسلام میں معنوی اور روحانی زندگی زیادہ وسیع اور گہری ہے کیونکہ اسلام نے اسے انسان کے تمام مثبت و منفی اعمال و حرکات تک وسیع کر دیا ہے۔ اور یہ جس بلند مقام پر پہنچتی ہے وہ دوسرے مذاہب کے آخری ہدف سے کئی مراحل بلند اور بالاتر ہے

۳

دعوتِ اسلامی کی بنیاد

اسلام کے آئینِ مقدّس نے تین بہت ہی سادہ اور روشن اصولوں پر اپنی بنیاد رکھی ہے :

پہلا اصُول

انسان اپنی زندگی کے لیے جس چیز کو سب سے زیادہ ضروری سمجھتا ہے وہ خوش حالی ، فلاح اور نجات ہے ۔ کسی شخص کو بھی اس چیز کی بنیادی اہمیت کے بارے میں کوئی شبہ نہیں ہو سکتا ۔ اور کسی شخص کے بھی نزدیک کوئی دوسری چیز اس سے زیادہ ضروری نہیں ہو سکتی ۔ کیونکہ ہر شخص کی یہی آرزو ہوتی ہے کہ وہ اپنی تمام ضروریات پوری کر کے ، مشکلات اور خامیوں کو دُور کر کے ایک خوشحال اور کامیاب زندگی گزارے اور نہایت آرام اور آسودگی کے ساتھ اپنے دن پورے کرے ۔

حتّٰی کہ وہ لوگ جو دوسروں کے آرام کے لیے اپنا چین وسکون قربان کر دیتے ہیں ، یا دوسروں کی راحت کے لیے خود تکلیف اٹھاتے ہیں ۔ وہ دراصل اپنے اس اندرونی دکھ اور رنج کو جو انھیں دوسروں کو تکلیف میں دیکھ کر ہوتا ہے دور کر کے ایک طرح کا سکون اور خوشی حاصل کرتے ہیں اور اپنی نجات و کامیابی کا احساس حاصل

کرتے ہیں ۔

اسی طرح وہ شخص جسے اپنی دنیوی زندگی سے کوئی دلچسپی نہ رہی ہو اور وہ موت ہی میں اپنی نجات سمجھنے لگا ہو اور اسے رنج و تکلیف میں اپنی خوش بختی نظر آنے لگی ہو تو وہ بغیر کسی جھجک کے خود کو موت کے منہ میں دے دیتا ہے یا خود کو رنج و تکلیف میں مبتلا کر لیتا ہے اور اسے ہر نعمت و آسائش پر ترجیح دینے لگتا ہے ۔

یہی وہ کامیابی اور نجات ہے جس کا پیغام رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی اس اوّلین حدیث میں دیا تھا جو آپ کی دعوت کا نقطۂ آغاز تھی ۔

آپؐ نے فرمایا تھا :

" اے لوگو ! خدا کی توحید کا اقرار کرو تا کہ تمھیں نجات حاصل ہو ۔"

" قولوا لا الٰہ الا اللہ تفلحوا "

دوسرا اصُول :۔

دوسری بنیاد یہ ہے کہ انسان حقیقت پسندی کی راہ سے اپنی نجات چاہتا ہے یعنی وہ ہمیشہ ایک ایسی کامیابی اور نجات کا خواہشمند رہتا ہے جو واقعی اور حقیقی کامیابی ہو نہ کہ محض تخیّلاتی اور فریب دینے والی کامیابی ہو ۔

اس دوسرے اصول کی اہمیت کو ذرا سے غور وفکر کے ذریعہ سمجھا جا سکتا ہے مثلاً ایک شخص سخت بھوکا ہے یا شدید پیاسا ہے ۔ کیا وہ پانی کے سوا کسی اور چیز کا متلاشی ہو سکتا ہے ۔ اس حالت میں اسے فی الواقع وہ چیز چاہیے جسے پانی یا روٹی کہا جا سکتا ہو ۔ اسے کسی خیالی و تصوّراتی پانی اور روٹی کی ضرورت نہیں ۔ اسے تو وہ چیز چاہیے جس کی اُسے ضرورت ہے اور جو اس کی پیاس اور بھوک کو رفع کر سکتی ہو

اُسے کوئی ایسی چیز نہیں چاہیئے جس کا نام غلطی سے پانی یا روٹی رکھ دیا گیا ہو اور فی الواقع وہ پانی اور روٹی نہ ہو۔

اگر انسان کے سامنے دو طرح کی زندگیاں ہوں۔ ایک زندگی ایسی ہو جسے شاہانہ، شان و شوکت والی اور عیش و آرام والی زندگی کہا جاسکتا ہو لیکن وہ محض خیالی اور تصوّراتی ہو اس کے برعکس دوسری قسم کی زندگی بڑی سادہ اور محدود ہو لیکن وہ حقیقی اور واقعی ہو تو انسان یقیناً اس دوسری زندگی کو جو حقیقی اور واقعی ہے اپنے لیے پسند کرے گا اور اس دوسری زندگی کو مسترد کر دے گا جو محض خیالی ہے۔ اور اس کا کوئی واقعی وجود نہیں ہے۔

انسان کی حقیقت پسندی کا نتیجہ

جو بھی شخص آئینِ اسلام کے حقیقی سرچشموں کتاب و سنّت (قرآن وحدیث) سے رجوع کرے گا اسے یہ بات تسلیم کرنے میں کوئی تامل نہیں ہوگا کہ اسلام کی ہر بات حقیقت اور واقعیت کی بنیاد پر استوار ہے۔ اسلام اپنے اس حقیقت پسندی کے اصول کی بنیاد پر ایک دوسرا حکم وضع کرتا ہے اور وہ یہ ہے کہ انسان کو ہر حال میں حق کی پیروی کرنی چاہیئے۔ یعنی اگر اس پر کوئی حق بات ظاہر ہو تو اسے اس سے چشم پوشی کرنے کی بجائے اسے بڑھ کر قبول کر لینا چاہیئے۔ اور عمل کے مرحلے میں بھی انسان کو وہ کام انجام دینا چاہیئے جو حقیقت کی بنیاد پر اس کے لیے سود مند ہو اگرچہ کہ وہ اس کی خواہش کے خلاف ہو۔ اس بیمار کی طرح جو اپنے علاج کے لیے ڈاکٹر کی ہدایت کے مطابق عمل کرتا ہے چاہے اس کو کڑوی اور ناگوار دوا بھی پینی پڑے۔

اسی طرح انسانی معاشرہ میں ان قوانین و ضوابط کا اجرا ہونا چاہیئے جن کا حقیقت و واقعیت کی اساس پر نافذ ہونا ضروری ہو۔ خواہ وہ اکثریت کی خواہش

یا اس کی متفقہ رائے کے خلاف ہی کیوں نہ ہو۔

اسلام کی نظر میں حق کو مطلق العنان حکمرانی حاصل ہے اور وہ کسی خواہش اور آرزو کا محکوم اور تابع نہیں ہوسکتا:

"فَمَاذَا بَعْدَ الْحَقِّ إِلَّا الضَّلَالُ"

(سورۂ یونس آیت ۳۲)

یہ اللہ تعالیٰ کا اپنی کتابِ مقدّس میں ارشاد ہے کہ:

"حق چھوڑنے کے بعد گمراہی کے سوا کوئی راستہ نہیں ہے۔"

پھر اس کا یہ ارشاد بھی ہے کہ:

"اگر حق لوگوں کی خواہشات کی پیروی کرتا تو یہ نظامِ کائنات درہم برہم ہو جاتا۔"

"وَلَوِ اتَّبَعَ الْحَقُّ أَهْوَاءَهُمْ لَفَسَدَتِ السَّمَاوَاتُ وَالْأَرْضُ وَمَنْ فِيهِنَّ۔"

(سورہ مومنون آیت ۷۱)

اسلام نے اس حقیقت کو بغیر کسی چون و چرا کے لازم اتباع قرار دیا ہے اور یہ انسان کے وجدانی فیصلے سے پوری طرح ہم آہنگ ہے۔ کوئی ایسا انسان نہیں ہے جس کا وجدان حق کی پیروی کو قبول نہ کرے یا حق کشی کو بُرا نہ سمجھے۔

بلاشبہ انسانی معاشرہ میں ایسے بہت سے لوگ ملیں گے جو عملاً حق کی مخالفت کرتے نظر آئیں گے اور حق کشی کی بہت سی مثالیں ملیں گی۔ لیکن جو لوگ حق سے منہ موڑتے ہیں جب ان کے کسی غلط کام پر ان کی سرزنش اور باز پُرس کی جاتی ہے تو وہ کوئی نہ کوئی عذر پیش کر دیتے ہیں اور فی الواقع وہ اپنے عذر کو حق کے مطابق بنانے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس لیے حالات خواہ کچھ ہی کیوں نہ ہوں ہر صورت و حالت میں

حق کی پیروی کی جانی چاہیے۔ یہ ایک نہایت معقول و مسلم اصول ہے۔

تیسرا اصول :-

انسان کو شاہراہِ زندگی پر گامزن رہتے ہوئے عقل و دانش کا رویّہ اختیار کرنا چاہیے۔ جذبات وخواہشات کے ہاتھ میں اپنی لگام نہیں دے دینی چاہیے۔ کیونکہ وہ واحد صفت جو انسان کو تمام حیوانات سے ممتاز کرتی ہے اور اسے سب سے الگ ایک مخصوص و مستقل نوع قرار دیتی ہے وہ عقل و خرد کی قوت ہے۔ جب وہ کوئی کام کرنا چاہتا ہے تو اپنی عقل و دانش کی مدد سے اس کے خیر و شر اور اس کے نفع ونقصان کا اندازہ کرلیتا ہے۔ اور صرف اسی وقت اس کام کا آغاز کرتا ہے جب اسے یہ یقین ہوجاتا ہے کہ وہ اس کے لیے سودمند ہے۔ بصورتِ دیگر اپنے جذبات و خواہشات کو لگام دے کر اس کام کے انجام دینے سے احتراز کرتا ہے۔ جب کہ دوسرے تمام حیوانات اپنی جبلّت کے ساتھ کام کرتے ہیں۔ عقل وخرد کی بنا پر نہیں اور یہ بات ظاہر ہے کہ انسان اپنی خوشحالی، کامیابی وفلاح کا مقصد، اپنی امتیازی صلاحیت یعنی عقل و دانش کے ذریعہ ہی حاصل کرے گا نہ کہ اس صلاحیت کے ذریعہ جو اس کے اور تمام حیوانات کے درمیان مشترک ہے۔

انسان کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنی انفرادی واجتماعی زندگی میں انسانی منطق سے کام لے نہ کہ چرنے چگنے والے اور درندہ حیوانات کی منطق سے۔ عقل اور وسائل زندگی کا سرچشمہ حقیقت پسندی ہے جسے ہم نے سطور بالا میں دوسرا اصول قرار دیا ہے اور عقل و دانش کو اسلام میں اس قدر اہمیت اور اعتبار حاصل ہے کہ اس نے ایک واضح اور روشن اصول کی حیثیت اختیار کر لی ہے جسے کسی پردے میں نہیں چھپایا جا سکتا۔ اسی لیے اسلام نے ایسے تمام کاموں کو حرام قرار دیا ہے جن کے نتیجے میں انسان

کام کرنے کے قابل نہ رہے یا اس کی عقل بہکنے لگے، جیسے نشہ آور چیزوں کا استعمال اور جھوٹ، معاملات میں دھوکہ دہی، دوسروں کو فریب دینے کے لیے دو عملی اختیار کرنا، دہشت انگیزی اور کسی پر چھپ کر اچانک حملہ کردینا وغیرہ۔

عقل و دانش سے کام لینے کا اصول ایک ایسا اصول ہے جس کے بارے میں انسانوں نے کبھی شک و شبہ سے کام نہیں لیا ہے۔ دنیا میں آپ کو کوئی ایک شخص بھی ایسا نہیں ملے گا جس کا وجدان عقل کی مذمت کرے۔ یا جسے نا سمجھی بُری نہ لگے۔ اگرچہ کہ عقل و دانش کا یہ اصول دوسرے اصول یعنی حقیقت پسندی کی طرح ہی ہے اور عملی مواقع پر مختلف بہانے تراش کر اس کی بھی بہت مخالفت کی جاتی ہے۔

ان تین اصولوں کا نتیجہ

خوشحالی ونجات، حقیقت پسندی وعقل و دانش ان تینوں اصولوں سے جو نتیجہ حاصل ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ انسان عقل وتدبّر کی راہ سے اپنی حقیقی کامیابی اور نجات حاصل کرے۔

مزید وضاحت :

یہ بات اکثر ہمارے مشاہدے میں آتی رہتی ہے کہ کبھی ہم بھوکے ہوتے ہیں اور ہمیں غذا کی ضرورت ہوتی ہے اور کبھی ہم پیاسے ہوتے ہیں اور ہمیں پانی کی ضرورت ہوتی ہے اور کبھی ہم بغیر لباس کے ہوتے ہیں اور ہمیں لباس درکار ہوتا ہے اور جب ہم تھک جاتے ہیں تو ہم آرام کی فکر کرتے ہیں۔ ان تمام حالتوں میں ہم اپنے وجود میں نقص کا مشاہدہ کرتے ہیں۔ اور ہم یہ محسوس کرتے ہیں کہ ہمارے وجود کے اندر کوئی ایسی چیز موجود ہے جو ہمیں اپنی ضروریات کے رفع کرنے کے لیے

آمادہ کرتی ہے۔ ہم جب اپنے اندر کسی چیز کی کمی محسوس کرتے ہیں تو اسے ضرورت کا نام دیتے ہیں اور وہ اندرونی عامل جو اس ضرورت کے رفع کرنے پر ہمیں آمادہ کرتا ہے ہم اسے ایک اندرونی و باطنی قوت کہتے ہیں۔ پھر جب اپنی ضرورت رفع کرنے کے لیے مطلوبہ چیز ہمیں مل جاتی ہے تو یہ چیز اس باطنی قوت کی خوشی اور کامرانی قرار پاتی ہے۔

انسان کو اکثر اپنی زندگی میں اس صورت حال کا سامنا کرنا پڑتا ہے کہ وہ اپنی کسی اندرونی قوت کی کوئی خواہش پوری کر دیتا ہے تو وہ اس قوت کے لیے تو تسکین بخش ہوتی ہے لیکن دوسری تمام قوتوں کے لیے جو اس کے اندر موجود ہیں نقصان و ضرر کا سبب بنتی ہے۔

اسی طرح ہر باطنی قوت کو اگر کھلی چھوٹ مل جائے تو وہ باقی دوسری قوتوں کو معطل کرنے اور بحیثیتِ مجموعی خود انسان کے وجود کو نقصان پہنچانے اور پھر نتیجتاً خود اپنے آپ کو نقصان پہنچانے کا سبب بن جائے گی۔ مثلاً لامتناہی عرصے تک آرام کرنے یا لامحدود کھانا اور پینا بالآخر انسان کی زندگی کے خاتمے پر منتج ہوگا۔

اپنے اس تجربے سے انسان بخوبی سمجھ لیتا ہے کہ اس کی خوشی اور کامرانی اسی کی اپنی اندرونی قوتوں میں سے ہر ایک قوت کی خوشی اور کامرانی سے الگ ایک چیز ہے۔ چنانچہ وہ اپنی مختلف اندرونی قوتوں کی مختلف خواہشات کا جائزہ لیتا ہے ان میں سے ہر ایک کے خیر و شر اور نفع و نقصان کو پرکھتا ہے اور ان میں سے جو بھی اسے سودمند نظر آتی ہے اسے وہ پوری کرتا ہے۔

یہ وہی عقل و دانش کی قوت ہے جو انسان کی گوناگوں خواہشات کا تجزیہ کرتی ہے اور ان میں سے چند کو پسندیدہ اور جائز اور چند کو ناپسندیدہ اور

ناجائز قرار دیتی ہے۔

ہمارے اس بیان سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ کوئی ایسا انسان نہیں ہے جو اپنی بھلائی اور کامیابی نہ چاہتا ہو اور اگر وہ چاہتا بھی ہے تو حقیقی اور واقعی بھلائی نہ چاہتا ہو۔ اگر کوئی ایسا انسان ہو جو اپنی عقل سے کام نہ لے تو اس کی مثال ایک بچے کی سی ہوگی یا ایک ایسے انسان کی سی ہوگی جو عقل و خرد سے محروم ہو۔ ایسا شخص اپنی انسانیت میں ناقص قرار پائے گا۔

بیرونی دنیا سے انسان کی شناسائی

جیسا کہ معلوم ہوا، ہرگز یہ تصور نہیں ہے کہ انسان اور اس کے عقل و شعور اور پھر اس کی اپنی ضروریات اور حاجات سے واقفیت کے درمیان کوئی خلا ہے بلکہ انسان ضروریات اور احتیاجات کے ایک رشتے سے بندھا ہوا ہے اور پھر اس کی ہر ضرورت و حاجت کے کچھ تقاضے ہیں۔

وہ اگر بھوکا ہوتا ہے تو اسے خوراک کی ضرورت ہوتی ہے۔
اگر وہ پیاسا ہے ـــــ تو اسے پانی درکار ہوتا ہے۔
اپنی برہنگی کو ڈھانکنے کے لیے اسے لباس اور پناہ گاہ چاہیے۔
وہ ہے تو اکیلا لیکن اس کی خواہشات اور ضروریات بے شمار ہیں
اسے دوستوں اور مددگاروں کی ضرورت ہوتی ہے۔

یہ ضروریات اور اس کے تقاضے ہی ہیں جو انسان کو بیرونی دنیا سے شناسا کرتے ہیں۔ پھر انسان کا یہی شعور و ارادہ ہے جو اسے اپنی ضروریات کی تکمیل کے لیے یعنی خوشحالی و کامیابی کے حصول کے لیے آمادہ کرتا ہے اور وہ اپنے روزِ پیدائش سے لے کر زندگی کے آخری لمحات تک ایک لمحے کے لیے بھی

آرام سے نہیں بیٹھتا۔ ایک مسلسل جد وجہد میں مصروف رہتا ہے۔

وسائل اور روابط کا ادراک

انسان کی خواہشات و ضروریات اور اسباب و وسائل کے درمیان ایسا گہرا رابطہ ہے جو اسے بیرونی مادّی دنیا سے تعلق رکھنے پر مجبور کرتا ہے بھوک کے رفع کرنے اور سیری حاصل کرنے کا گوشت اور روٹی کے ساتھ ایک کبھی ختم نہ ہونے والا تعلق ہے اسی طرح پانی پیاس کو دور کرتا ہے اور لباس انسان کو سردی اور گرمی کی شدّت سے بچاتا ہے۔ انسان کو بہت جلد اس بات کا شعور حاصل ہو جاتا ہے کہ اس کے اور اجزا و عناصرِ عالم کے درمیان ایک گہرا رابطہ ہے۔ وہ علم و تحقیق میں جس قدر آگے بڑھتا جاتا ہے اس پر ان روابط کی تفصیل اسی قدر واضح ہوتی جاتی ہے۔

اسباب و علل کا یہ وہ عام اصول ہے جس پر یہ سارا نظامِ کائنات استوار ہے۔ اسی لیے یہ بات زبان زدِ عام ہے کہ

"کسی سبب کے بغیر کوئی واقعہ رونما نہیں ہوتا۔"

گروہِ انسانی سے تعلق رکھنے والے ہم سب افراد اس سلسلۂ اسباب پر یقین رکھتے ہیں اور ہمارا ایمان ہے کہ سبب اور مسبّب کے درمیان گہرا تعلق موجود ہے۔ صرف ہم انسان ہی نہیں، بے زبان حیوانات بھی اپنے فطری شعور کی بنیاد پر اسی یقین و ایمان سے بہرہ مند ہیں اور وہ اپنے مقاصدِ زندگی کی تکمیل کے لیے مناسب اسباب اور وسائل سے کام لینے میں مصروف ہیں۔ جب انھیں بھوک لگتی ہے تو وہ غذا کی تلاش میں نکلتے ہیں۔

پیاسے ہوتے ہیں تو پانی کے متلاشی ہوتے ہیں۔

وہ تھک جاتے ہیں تو اپنی تھکاوٹ دور کرنے کے لیے اپنے

ٹھکانوں اور آشیانوں کا رُخ کرتے ہیں۔

اپنی نسل کو بڑھانے کے لیے ان کے نر و مادہ ایک دوسرے کے قریب ہوتے ہیں ——— ؛

اور ——— ،

اپنے دشمن سے بچاؤ کے لیے ،

وہ اپنے دانتوں، پنجوں، ڈنک، سینگوں اور چونچ سے کام لیتے ہیں یا اپنے پیروں کی مدد سے راہِ فرار اختیار کرتے ہیں۔

عقل و شعور رکھنے والے حیوانات ہی نہیں ———

بلکہ ——— اس کائنات کے دوسرے موجودات جیسے :

جمادات ——— و ——— نباتات ،

جنھیں ہم عقل و شعور سے بے بہرہ سمجھتے ہیں۔ ان کی فطرت بھی اس سلسلۂ اسباب کا احساس رکھتی ہے اور اس کے تقاضوں کو پورا کرتی رہتی ہے

مثلاً : ———

جس طرح ایک حیوان کو جب بھوک لگتی ہے تو وہ اپنی فطرت کے مطابق غذا تلاش کرتا ہے اور اپنی بھوک رفع کرتا ہے ——— ؛

اسی طرح ———

ایک پودا یا سبزہ ، جب اسے غذا کی ضرورت ہوتی ہے تو وہ اپنی جڑوں اور ریشوں کی مدد سے زمین کی گہرائی میں سے مناسب غذا جذب کر لیتا ہے۔

اسی طرح ———

جمادات سے تعلق رکھنے والی بے جان چیزیں بھی کسی خاص سبب کے زیرِ اثر ظاہر ہوتی ہیں ——— ؛

اس دنیا کا ہر زندہ وجود تکمیلِ ذات کی ایک زور دار خواہش اپنے دل میں رکھتا ہے ——— اور وہ اپنے روزِ پیدائش سے لے کر زندگی کے آخری لمحے تک اسی مقصد کے حصول کے لیے مسلسل سرگرم اور مصروف رہتا ہے۔ (انسان کا بچہ ایک مکمل مرد یا عورت بننے کی خواہش رکھتا ہے)

اسی طرح

جب کوئی دانہ یا کونپل زمین کا سینہ چیر کر ظاہر ہوتی ہے تو اس کی آخری منزل، ایک مکمل پودے یا درخت کی صورت اختیار کرنا ہوتی ہے۔

اور کوئی عنصری مواد

جب اپنی فطرت کے مطابق تحلیل ہوتا ہے تو اس کا کمال ایک خاص مرکب میں ڈھل جانا ہوتا ہے۔

زندگی کے لائحہ عمل کی بنیاد

یہاں ہم ایک ایسے انسان کی مثال سامنے رکھ سکتے ہیں جس نے اپنی خواہشِ نفس کو اپنی زندگی کا لائحۂ عمل قرار دے لیا ہے۔ وہ بغیر کسی مشکل اور رکاوٹ کے اپنی دلی خواہشات کے پورا کرنے میں لگا رہتا ہے یہاں تک کہ وہ ایک کامیاب اور پرمسرت زندگی بسر کرنے کے قابل ہو جاتا ہے۔ ایک مرحلہ ایسا آتا ہے کہ وہ سب سے زیادہ طاقت ور انسان بن جاتا ہے اور پھر وہ اپنی خواہشات کو دوسروں پر مسلط کرنے لگتا ہے اور انھیں اپنا نوکر اور غلام بنا لیتا ہے۔ ظاہر ہے اس کے نتیجے میں لازماً معاشرہ پر ایک طرح کی ڈکٹیٹر شپ اور استبداد مسلط ہو جائے گا۔

ایک دوسری مثال پر غور کیجیے:

کسی معاشرہ کے افراد استبداد سے نجات حاصل کرنے اور غلامی کی حالت سے باہر نکلنے کے لیے اپنے معاملات کی باگ ڈور خود اپنے ہاتھوں میں لے لیتے ہیں اور بگاڑ اور اختلاف کے سدِباب کے لیے وہ اکثریت یا اتفاقِ رائے کے طریقے کو اپنا دستور بنا لیتے ہیں۔ ظاہر ہے اس صورت میں معاشرہ کے اندر ایک طرح کے اجتماعی طریقے کو فروغ حاصل ہوگا۔ یہ بات ہم سب کو معلوم ہے کہ انسان اپنی تاریخ کے گزشتہ طویل عرصے میں ان دونوں طریقہ ہائے زندگی کا تجربہ کر چکا ہے اور وہ ان کی تلخی و شیرینی کا خوب مزہ چکھ چکا ہے اور آج بھی چکھ رہا ہے۔

لیکن اسلام اپنے سہ گانہ اصولوں (نجات و فلاح، حقیقت پسندی، اور عقل و دانش کا استعمال) کی بنا پر متذکرہ دونوں اجتماعی طریقوں میں سے کسی کو بھی پسند نہیں کرتا۔ وہ انسانی معاشرہ کے معاملات کی باگ ڈور کسی ایک فرد یا اکثریت کی خواہشات کے ہاتھ میں دینے کا مخالف ہے۔

جذبات و خواہشات کی بنیاد پر زندگی کی تعمیر کرنا اس انسانی شرف و امتیاز کے خلاف ہے جو انسان کو حیوان سے ممتاز کرتا ہے ——— انسان کو عقل و شعور سے سنوارا گیا ہے اور وہ اس کی مدد سے اپنے اچھے برے، نفع نقصان اور خیر و شر کو پہچانتا ہے اور کوئی بھی قدم اٹھانے سے پہلے وہ عقل و دانش سے پوری طرح کام لیتا ہے۔ اس کے برخلاف حیوانات اپنی خواہش و جبلّت کے تحت کام کرتے ہیں جب جذبات و خواہشات کو حکمرانی حاصل ہو جاتی ہے اور صحیح و غلط، حق و باطل کا لحاظ کیے بغیر خواہشات کی تکمیل کی راہ اختیار کی جاتی ہے تو عقل و خرد کی قوتیں بے کار اور معطل ہو کر رہ جاتی ہیں اور ارشادِ قرآنی کے مطابق انسانی منطق کی جگہ حیوانی منطق لے لیتی ہے۔

کلامِ ربانی ہے:

"وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا يَتَمَتَّعُوْنَ وَيَاْكُلُوْنَ كَمَا تَاْكُلُ الْاَنْعَامُ"

(سورہ محمدؐ آیت ۱۲)

"اور کفر کرنے والے بس دنیا کی چند روزہ زندگی کے مزے لوٹ رہے ہیں، جانوروں کی طرح کھا پی رہے ہیں۔"

انسانی معاشرہ جو اس پوری کائنات کا ایک حصہ ہے اس کے لیے کوئی ایسی روش اختیار کرنا مناسب نہیں ہے جو اسے اس بڑی دنیا سے الگ کر دے۔ اس جہانِ آفرینش میں کوئی ایک چیز بھی ایسی نہیں ہے جو اپنے ماحول کے اثرات سے متاثر ہوئے بغیر اپنے فرائض انجام دے سکے۔ موجوداتِ عالم میں سے ہر موجود کا ایک مقصدِ زندگی ہے اور فطرت نے اس مقصد کی مناسبت سے اسے وسائل و آلات فراہم کیے ہیں جن سے وہ کام لے کر اپنے مقصدِ زندگی کی جانب قدم بڑھاتا ہے۔ فطرت کا یہ قانون تمام مخلوقات میں تمام سادہ عناصر اور پیچیدہ مرکبات میں جاری ہے۔

انسانی دنیا بھی اس بڑی کائنات کا ایک جزء ہے اور وہ اپنے چھوٹے سے چھوٹے معاملات میں بھی اس کائنات کے عمومی نظام کے خلاف نہیں جا سکتی۔ فطرت نے انسان کو اس کی زندگی کے مقصد کے مطابق قوتیں اور وسائل عطا کیے ہیں اور فطرت اس کے مقصد کی جانب اس کی رہنمائی کرتی ہے اس لیے اسے اپنی فطرت کے تقاضے اور اپنے اطراف موجود اس بڑی کائنات کو سامنے رکھ کر کام کرنا چاہیے یعنی ان فرائض کو اپنی زندگی کا لائحہ عمل بنانا چاہیے جن کا فطرت اس سے تقاضا کرتی ہے۔ اسے اپنی بے لگام خواہشات اور اندھے جذبات کی پیروی نہیں کرنی چاہیے۔

اس بحث کا حاصل یہ ہے کہ انسان کو اپنی زندگی میں ایسی روش اختیار کرنا چاہیے جو فطرت کے مطابق ہو نہ کہ وہ طریقے جو اس کی خواہشِ نفس کو پسند ہوں دوسرے الفاظ میں انسان کا دین، دینِ فطرت ہونا چاہیے اسے خواہشاتِ نفس کی پیروی نہیں کرنی چاہیے۔

ارشادِ ربانی ہے:

"فَاَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّيْنِ حَنِيْفًا فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِيْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا لَا تَبْدِيْلَ لِخَلْقِ اللّٰهِ ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ"

"پس یکسو ہو کر اپنا رخ اس دین کی سمت میں جما دو۔ قائم ہو جاؤ اس فطرت پر جس پر اللہ تعالیٰ نے انسانوں کو پیدا کیا ہے۔ اللہ کی بنائی ہوئی ساخت بدلی نہیں جا سکتی۔ یہی بالکل راست اور درست دین ہے۔"

(سورہ روم آیت ۳۰)

انسان کو اپنے نفس کی پیروی نہیں کرنی چاہیے جیسا کہ انسان کو غذا کے چبانے، پینے اور ہضم کرنے کے اعضا دیے گئے ہیں اس لیے اسے کھانا اور پینا چاہیے۔

اسے آلاتِ تناسل دیے گئے ہیں اس لیے اسے ازدواجی تعلقات قائم کرنے چاہئیں۔

اس کے جسم کو ایک نازک کھال دی گئی ہے وہ جانوروں اور پرندوں کی طرح

بال اور پر نہیں رکھتا اس لیے اُسے لباس پہننا چاہیے۔

اسے خطرات کے دفع کرنے کے لیے وسائل دیے گئے ہیں اس لیے اسے اپنی زندگی کی حفاظت کی کوشش کرنی چاہیے۔

اسے کھانا پینا اور جنسی تعلقات ترک کرنے کی آزادی نہیں دی گئی ہے اسے خودکشی کی اجازت نہیں دی گئی ہے۔ اسلام نے تمام ضروریاتِ زندگی پوری کرنے کھانے پینے اور لباس پہننے کا حکم دیا ہے۔

اس بحث کی مزید وضاحت یہ ہے کہ:

فطرت کے ان تمام تقاضوں سے وہ انحراف نہیں کر سکتا۔ انسان جو کام بھی انجام دیتا ہے اس کے لیے مناسب وسائل استعمال کرتا ہے جیسے وہ دیکھنے کے لیے آنکھ، سننے کے لیے کان، چیزوں کو پکڑنے اور اٹھانے کے لیے ہاتھوں کو استعمال کرتا ہے اور اپنے کسی بھی کام کی تکمیل کے لیے وہ موافقت کا انتظار نہیں کرتا۔

انسان کی یہ فطرت ہے کہ وہ ہر رونما ہونے والے واقعہ کی کڑیوں کو ان سابقہ واقعات سے جوڑتا ہے جو اس واقعہ سے مربوط ہوں اور پچھلے تمام واقعات سے اس نئے رونما ہونے والے واقعہ کے روابط کو منقطع نہیں کرتا۔ اور وہ اس بات کو بھی اچھی طرح سمجھتا ہے کہ اس عالمِ اسباب کے کارخانے نے اپنے اندر ڈھلنے والی ہر چیز کو اس طرح بنایا ہے کہ وہ زندگی بسر کرنے کے ایک خاص راستے کو اختیار کرنے پر مجبور ہے اور اس راستے کو ترک کر کے کوئی اور راستہ اختیار کرنا اسے موت اور ہلاکت کی طرف لے جاتا ہے۔

مثلاً اگر درخت اپنی جڑوں کے ذریعہ پانی حاصل کرنا چھوڑ دیں اور حیوانات سانس لینا ترک کر دیں تو وہ اپنی نباتی اور حیوانی زندگی سے محروم ہو کر مٹی میں مل جائیں گے۔

اس سے یہ بات پوری طرح واضح ہو جاتی ہے کہ دنیا کی ہر مخلوق اسباب و علل کے اس خاص رشتے میں بندھی ہوئی ہے جو فطرت نے اس کے لیے تیار کیا ہے اور وہ اس راستے پر چلنے کے لیے مجبور ہے جو قدرت نے اس کے لیے بنایا ہے

اگرچہ انسان کو اس کے شعور اور ارادے کی بنا پر ایک طرح کی آزادی حاصل ہے ــــ

لیکن ــــــــ

ایسی ہی آزادی اس کے تمام ہم نوع دوسرے انسانوں کو بھی حاصل ہے۔

اور وہ اس آزادی میں ان کے ساتھ بالکل برابر اور مساوی ہے

اور وہ اپنی آزادی کو ــــــ

اُن بعض علل و اسباب کی بنا پر ختم نہیں کر سکتا جو اس کو وجود میں لانے کا سبب بنے ہیں یا اس کی زندگی میں عمل دخل رکھتے ہیں۔

اگر انسان اتفاقاً اسبابِ فطرت میں سے کسی ایک سبب کو ترک کرتا ہے

مثلاً دھوپ میں سے نکل کر سائے میں آتا ہے ــــ

اور بارش سے بچنے کے لیے کوئی پناہ گاہ تلاش کرتا ہے ــــ

تو ــــــ

درحقیقت وہ ایک سبب کو ترک کر کے دوسرے سبب کو اختیار کرتا ہے

اس لیے انسان اپنی حقیقت بینی کی خداداد صلاحیت سے کام لے کر ہمیشہ یہ سمجھتا ہے کہ وہ عدم استقلال اور بے بسی کی حالت سے دوچار ہے اور ساتھ ہی یہ معلوم کرے کہ ــــــ

اس کارخانۂ قدرت نے اور اس حیاتِ دنیوی نے اس پر کن فرائض اور ذمہ داریوں کا بوجھ ڈالا ہے اور پھر فطرت کے مقرر کردہ راستے پر چل کر ــــ

اطاعت وفرمانبرداری کا کون سا طریقہ اختیار کرے۔

اس حقیقت کو بھی وہ پیشِ نظر رکھے کہ اس دنیائے فانی کے تمام باشندے اور اس میں رائج نظام ہائے حکومت بھی خود اس کی طرح غیر مستقل ہیں اور سب کے سب پروردگارِ عالم کی ربوبیت اور تخلیق کے محتاج ہیں۔

اور ———

خود کو اللہ تعالیٰ کا بندہ اور غلام سمجھے۔

اور اللہ تعالیٰ کی ہدایات اور احکام بجا لاکر ایک مطیع اور فرمانبردار کی طرح زندگی بسر کرے اور اس دنیائے فانی میں خدائے بزرگ و برتر کے ارادے اور مرضی کا مظہر بنے ———

اللہ تعالیٰ کی مرضی کو پہچاننا دراصل ان ہی فرائض اور ذمہ داریوں کو پہچاننا ہے جن کی جانب خود انسانی فطرت اور اس کائنات کی فطرت رہنمائی کرتی ہے۔

ہماری اس بحث سے یہ بات پوری طرح واضح ہوگئی کہ ایسے تمام طریقہ ہائے زندگی جو ایک فرد یا اکثریت کی خواہشات کی اساس پر بنائے گئے ہیں وہ کمزور اور بے بنیاد ہیں اور صرف اسلام (خدا کی اطاعت و فرمانبرداری) ہی کا طریقہ وہ طریقہ ہے جو فی الواقع ایک مضبوط بنیاد رکھتا ہے۔

اللہ بزرگ و برتر نے ارشاد فرمایا ہے۔

"اَفَرَءَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰهَهٗ هَوٰىهُ
وَاَضَلَّهُ اللّٰهُ عَلٰى عِلْمٍ وَّخَتَمَ عَلٰى
سَمْعِهٖ وَقَلْبِهٖ وَجَعَلَ عَلٰى بَصَرِهٖ
غِشٰوَةً ؕ فَمَنْ يَّهْدِيْهِ مِنْۢ بَعْدِ

اللّٰهِ ؕ" (سورہ جاثیہ آیت ۲۳)

"جو شخص بھی اپنی خواہشاتِ نفس کی اطاعت و فرمانبرداری کرتا ہے اور جان بوجھ کر گمراہی کی راہ اختیار کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ پوری طرح اس پر اتمامِ حجت کے بعد اسے گمراہی کی تاریکی میں بھٹکنے کے لیے چھوڑ دیتا ہے، اس کے کانوں اور اس کے دل پر مہر لگا دیتا ہے اور اس کی آنکھوں پر پردہ کھینچ دیتا ہے جب وہ خدا کی بات نہیں سنتا تو پھر خدا کے بعد اور کون ہے جو اسے ہدایت دے سکے۔"

کیا اس سے یہ بات واضح نہیں ہوتی کہ خدا پرستی کی راہ کے سوا دوسری تمام راہیں گمراہی کے راستے ہیں۔

۴

ہم کو خدا سے وابستہ رہنا چاہیئے

آج ہم جس دور میں زندگی بسر کر رہے ہیں اور جس کی آغوش میں تربیت پا رہے ہیں اُس نے انسانیت کو اجتماعی زندگی کے ایک حیرت انگیز مرحلے میں پہنچا دیا ہے۔ آج انسان اپنی علمی اور سائنسی صلاحیت کی بنا پر زندگی کے ہر گوشے میں عمل دخل حاصل کر چکا ہے اور تمام ضروری وسائل سے خود کو لیس کر چکا ہے۔ اس ترقی کے نتیجے میں اس کی سینکڑوں اور ہزاروں ضرورتیں آسانی کے ساتھ پوری ہو رہی ہیں۔ اور وہ اپنی زندگی کے مسائل حل کرنے کے لیے عقل و فکر سے کام لیتا ہے۔

یہ بات بالکل واضح ہے کہ انسان نے انسانی مقاصد اور اغراض کے پورا کرنے کے لیے ہی سرکش مادی طاقت اور فطرت کو مسخر کیا ہے اور اپنے لیے یہ سارے جدید وسائل فراہم کیے ہیں۔ اور طرح طرح کی ایجادات سے کام لیا ہے وقت کے ساتھ ساتھ اس کا کام بھی بڑھتا رہا اور اس کی جد و جہد طرح طرح کی صورتیں اختیار کرتی رہی۔ اور اس کی حرکت و عمل کا پہیہ برق رفتاری کے ساتھ گھومنے لگا۔

ماضی میں انسان اپنے وقت کا حساب روز و شب اور صبح و شام کے پیمانے

سے لگاتا تھا، لیکن آج ہم وقت کا حساب لگاتے ہیں تو ایک ایک سیکنڈ اور ایک ایک منٹ کا شمار کرتے ہیں۔ ہمارے اس دورِ جدید میں سیکنڈ کے سویں بلکہ ہزارویں حصے میں بھی دقیق علمی و سائنسی کام انجام پا جاتے ہیں۔ آج عمل کے بازار میں سیکنڈوں اور منٹوں نے بھی اپنی قدر و قیمت حاصل کر لی ہے جبکہ ماضی میں ایک گھنٹے اور ایک پورے دن کو ایسی قدر و قیمت حاصل نہ تھی۔

یہ بات بھی بالکل واضح ہے کہ انسانی قوت و صلاحیت اور اس کا میدانِ کار خواہ کتنا ہی وسیع کیوں نہ ہو، بالآخر وہ محدود ہی ہے۔ جب انسان اپنی قوت و صلاحیت کو کسی ایک رخ پر لگاتا ہے تو دوسرے رُخ پر اس کی توجہ کم ہو جاتی ہے۔

اسی حقیقت کی بنا پر آج کے دَور میں روحانیت پر مادیّت غالب آ چکی ہے۔ اس دور کا انسان اپنے پورے حواس کے ساتھ مادیّت کی جانب متوجہ ہے

اسی لیے ——

روحانیت اور دینی معنویت کے چہرہ پر ایک دبیز پردہ پڑ گیا ہے۔

اگر آپ ادیان و مذاہب کی تاریخ ——،

اور ——

ماضی کے انسان کی دینی حالت کا مطالعہ فرمائیں اور آج کے انسان کی دینی حالت سے اس کا موازنہ فرمائیں ——،

تو ——

اس بات کی سچائی آپ پر پوری طرح واضح ہو جائے گی۔

اس بات کے تسلیم کرنے میں بھی کوئی تامل نہیں ہو سکتا کہ مادیّت کی جانب بہت زیادہ جھکاؤ اور اعتدال کی راہ سے انحراف نے روحانیت میں کمی

کر دی ہے اور دل و دماغ سے دینی اثرات کو محو کر دیا ہے ۔

آج ہم دینی مطالب اور روحانی و معنوی اصولوں کے بارے میں مختلف زبانوں سے طرح طرح کے جو اعتراضات سنتے رہتے ہیں اور دینی تعلیمات اور خدا پرستی کے طریقوں پر اپنوں اور غیروں کے جن اعتراضات کا مطالعہ کرتے رہتے ہیں ۔

ان سب کا سرچشمہ وہی مادّہ پرستی ہے ۔

ہر انصاف پسند شخص پر یہ بات پوری طرح واضح ہے کہ ——

یہ اعتراضات کوئی نئے نہیں ہیں ——

ماضی کے ہر دور میں، اس طرح کے اعتراضات برابر اُٹھائے جاتے رہے ہیں اور یہ بحث کا موضوع بنتے رہے ہیں۔

اور معترضین ——

اپنے اعتراضات کے معقول و مدلّل جوابات سُن کر خاموش ہوتے رہے ہیں —— اور —— اپنے شبہات و اعتراضات کو بھلا دینے پر مجبور ہو گئے ہیں ۔

لیکن جس کا منہ بند نہیں ہوتا —— اور —— جو ذرا بھی موقع پاکر بلا دلیل کٹ حجتی پر اُتر آتی ہے ——

وہ یہی مادّیت کی روح ہے ——

جو کبھی فطرت کے دلفریب مناظر کو دیکھ کر مسحور ہو جاتی ہے اور کبھی اندرونی جذبات و احساسات سے مغلوب ہو جاتی ہے ۔ وہ اپنی مادّیت میں اس قدر گرفتار ہے کہ ——

عقلِ سلیم سے ذرا بھی رہنمائی حاصل کرنا اس کے لیے مشکل ہے ۔

روحِ مادّیت نے انسان کے تمام اندرونی حواس کو جو شعور و ارادہ سے

لیس ہیں، مادّے کی جانب پھیر دیا ہے اور روحانیت کی تحقیر کے لیے اس نے اپنی زبان کھول دی ہے اور وہ پوری ڈھٹائی کے ساتھ کہتی ہے ——

کہ —— !

دینی تعلیمات انسان کو ماضی کے اس تاریک دور میں لے جاتی ہیں جب وہ جنگلوں اور غاروں میں وحشیانہ زندگی بسر کرتا تھا ۔

ہر چیز سے تعلق توڑ کر ——

ایک نظر نہ آنے والے خدا سے رشتہ جوڑنے کا ——

آخر کیا مطلب ہے —— ؟

اس کا مطلب بجز اس کے اور کیا ہے کہ انسان اپنے فطری شعور اور ارادے کا گلا گھونٹ دے —— اور —— کسی غیبی طاقت کے انتظار میں بیٹھ جائے ——

جبکہ اس غیبی طاقت کا کوئی وجود ہی نہ ہو۔

اگر دینی تعلیمات پر آنکھیں بند کر کے عمل کرنے سے ہی انسان کو کھانا پینا میسّر آتا ہے تو پھر دنیا کی ترقی یافتہ قوموں کو جو چاند اور ستاروں پر کمندیں ڈال رہی ہیں اور آسمانوں کو مسخّر کر رہی ہیں ، انھیں بھوک سے مر جانا چاہیئے۔

اس طرح کے اعتراضات صرف آج کے انسان کے ذہن کی پیداوار نہیں ہیں ۔ یہ دراصل ماضی کے بے دلیل اور بے بنیاد افکار کا ورثہ ہیں اور اس امر کے گواہ ہیں کہ کسی ایک شعبے میں انسان نے جو ترقی کی ہے وہ دوسرے شعبے کے لیے نہیں ہے اور دوسرے شعبے میں اس کی لاعلمی اور جہالت کو یہ ترقی دور نہیں کر سکتی۔

یہ بات درست ہے کہ طبیعی علوم ایک روشن چراغ کی حیثیت رکھتے ہیں اور اس چراغ کی روشنی نے بہت سی چیزوں کو تاریکی سے نکال کر روشنی میں لا رکھا ہے۔ اور انسان کو ان سے واقف کر دیا ہے۔

لیکن یہ کوئی ایسا چراغ نہیں ہے جو ہر طرح کی تاریکی کو دور کر دے۔

علمِ نفسیات، فلکیات کے مسائل کو حل نہیں کر سکتا ——

کوئی ڈاکٹر کسی انجینئر کے پیچیدہ مسائل کو نہیں سلجھا سکتا ——

جو علم مادّیت سے بحث کرتا ہے وہ مادّے سے ماوراء معنوی اور روحانی مسائل سے بے خبر ہوتا ہے ——

وہ ان مقاصد تک رسائی نہیں رکھتا جن تک انسان اپنی خداداد فطرت کے تقاضوں کی بنا پر پہنچنا چاہتا ہے۔

مختصر یہ کہ آپ اگر کسی بھی طبیعی علم کے ذریعے مادّے سے ماوراء کسی مسئلے کے بارے میں کچھ معلوم کرنا چاہیں گے تو اس کے پاس خاموشی کے سوا اور کچھ نہ ہوگا کیونکہ اس علم کا موضوع مادّہ ہے اور مادّہ سے ماوراء ہر مسئلہ اس کے لیے ناقابلِ حل ہے۔ جب کوئی موضوع اس کی بحث سے خارج ہو تو اسے یہ حق حاصل نہیں ہے کہ وہ اس کے بارے میں کوئی خیال مثبت و منفی ظاہر کرے۔

دینی منطق خواہ کچھ بھی ہو، واضح یا غیر واضح —— روشن یا تاریک (یقیناً وہ واضح اور روشن ہی ہے) وہ دینی علوم میں گہرائی تک پہنچنے اور عالمِ طبیعت اور مادّہ کے پس پردہ حقائق کی جستجو اور اُن کے بارے میں غور و بحث کے سوا اور کوئی راہ نہیں رکھتی۔

قرآن نے سب سے کٹ کر خدا سے جُڑنے کی تعلیم دی ہے۔ یہ قرآنی منطق مندرجہ ذیل تین حقائق پر غور کرنے سے بخوبی روشن ہو جاتی ہے:

① —— قرآنِ کریم نے علت و معلول کے قانونِ کلی کا انکار نہیں کیا ہے۔ وہ دنیا میں رونما ہونے والے ہر حادثے اور زندگی میں ظاہر ہونے والی ہر نئی چیز اور واقعہ کو ان علل اور عوامل کے ساتھ متعلق کرتا ہے جو اس سے مناسبت رکھتے ہیں۔ وہ کسی بھی حادثے کے اتفاقی اور بلا سبب ہونے کو تسلیم نہیں کرتا۔

اس جہانِ آفرینش میں تمام چیزیں ایک دوسرے سے مربوط ہیں اور علت و معلول کے ایک نظام سے بندھی ہوتی ہیں۔ یہ حقیقت آغازِ قرآن سے لے کر آخرِ قرآن تک وحی کی زبان سے بخوبی واضح ہوتی ہے۔

انسان کی حیثیت اس ناچیز قطرے کی سی ہے جو ایک تباہ کن سیلاب کے منہ میں پڑا ہوا ہے اور انتہائی بے چارگی کے عالم میں موجوں کے ساتھ بہتا رہتا ہے اور نشیب و فراز طے کرتا ہے۔ انسان اس دنیائے فانی کے اجزا کا ایک جز ہے۔ اور ساری مخلوقات کے ساتھ خود بھی اس عمومی قانون کا پابند ہے جو اس دنیا پر نافذ ہے۔ وہ اس عالمِ ناپائیدار کا ہم سفر ہو کر ایک اجتماعی مقصد اور اصل منزل (آخرت) کی جانب رواں دواں ہے۔

انسان اس عالمِ کل کا ایک جُز ہے۔ اسے کوئی ایسی مستقل بالذّات حیثیت اور خود مختاری حاصل نہیں ہے کہ جس کے بل بوتے پر وہ سب سے الگ تھلگ ہو کر اپنے

مقاصد اور آرزوؤں کی تکمیل میں مصروف ہو جائے
اور اس عالمِ آفرینش کی کلی طاقت سے کشمکش اور
مزاحمت شروع کردے۔ انسان کے لیے بجز اس کے
اور کوئی راہ کھلی ہوئی نہیں ہے کہ جو کچھ طاقت
اسے دی گئی ہے اسے وہ اپنے مقاصد کے حصول
میں صرف کرے۔ اس عالمِ اسباب کے دوسرے اجزا
کی جس قدر اس سے موافقت حاصل ہوگی اسی قدر اس کے
مقاصد کی تکمیل ہوتی چلی جائے گی۔

(۲) ——— قرآنِ کریم نے جیسا کہ انسانی فطرت بھی یہی کہتی ہے
اس عالمِ کل اور اس کے تمام اجزاء کو خدائے واحد کی
مرضی اور ارادے کا پابند قرار دیا ہے۔ اور اس عالمِ آفرینش
کے نظام کو جو اپنے عمومی اور کلی قوانین کے ساتھ کارفرما
ہے۔ خالقِ کائنات کی تدبیر اور اس کے ارادے کا ماتحت
اور محکوم بتایا ہے۔

قرآنِ کریم کے اس بیان کے مطابق اس جہانِ ہستی میں
اگر کسی کو مطلق استقلال حاصل ہے اور اگر کسی کو اپنی
ذات اور اپنے آثارِ ذات میں باہر سے کسی مدد اور
سہارے کی ضرورت نہیں ہے اور جس کے سب محتاج
ہیں تو ایسی ذات صرف اس خدائے یگانہ کی ہے جس
نے ہر چیز کو پیدا کیا ہے اور اسے قوت عطا کی ہے
تنہا اسی کی ذات ہے جو اس بات کی مستحق ہے

کہ اس سے ہر طرح سے تعلق اور وابستگی پیدا کی جائے۔

(۳) ——— قرآنِ کریم نے انسانی علم کو محدود قرار دیا ہے اور
تمام اشیاء کی تمام صفات کا مطلق علم جسے علمِ غیب
کا بھی نام دیا جاتا ہے صرف خدائے یگانہ سے مخصوص
کیا ہے۔ اس اعتبار سے انسان کا شعور و ادراک ایک
بہت ہی چھوٹے چراغ کی مانند ہے جسے اس دنیا کے
وسیع اور تاریک ماحول میں روشن کیا گیا ہے۔ لیکن
اس کی روشنی اس قدر کمزور ہے کہ صرف ایک قدم کے
لیے وہ زمین کی ہمواری و ناہمواری کو ظاہر کرسکتی ہے۔
انسان اپنی اس زندگی کے تنگ اور محدود دائرے میں
اپنے ضعیف حواس اور کوتاہ فکر کے ذریعے حوادث و
واقعات کے اسباب و علل کا جو بھی علم حاصل کرتا ہے
وہ بہت ہی کم اور حقیر ہے۔ اس کی محدود معلومات
کا اس کی لامحدود مجہولات (جو کچھ اسے معلوم نہیں
ہے) کے ساتھ کوئی موازنہ نہیں کیا جاسکتا۔

ان حقائق سے یہ بات پوری طرح ظاہر ہو جاتی ہے کہ اسبابِ ظاہری
کے ساتھ پوری دل بستگی اور پُر امیدی، اسی طرح ناامیدی اور مایوسی، یہ
دونوں ہی طرح کی کیفیات جہالت اور نادانی کا نتیجہ ہیں۔

کیونکہ ———

انسان اپنے محدود علم و ادراک کے ذریعہ، اسباب و علل کے بارے
میں بہت ہی محدود معلومات حاصل کرتا ہے۔

پھر اپنی محدود طاقت کی مدد سے تھوڑے سے وسائل فراہم کر کے کسی مقصد کے حصول کی کوشش کرتا ہے،

اور بہت پُرامید ہو کر ——

لمبی چوڑی توقعات وابستہ کر لیتا ہے —— لیکن جب بعض اسباب وتدابیر اس کے مقاصد اور آرزوؤں کے خلاف صورت اختیار کرتے ہیں تو وہ ——

مایوس اور ناامید ہو جاتا ہے ——

یہ طرزِ فکر اس کی جہالت اور نادانی کا نتیجہ ہے۔

دنیا میں کسی بھی چیز کا پیدا ہونا یا فنا ہو جانا، کائنات کی ایک ہمہ گیر طاقت سے وابستہ ہے جس کے پیچھے لامحدود قوت اور ارادۂ غیبی کارفرما ہے اور انسان کو اس بات کا اختیار حاصل نہیں ہے کہ وہ اس طاقت کی مخالفت یا اس کے ساتھ موافقت میں سے کسی ایک چیز کو منتخب کرے

انسان اسباب وعوامل جمع کرتا ہے ——

لیکن —— کسی چیز کے وجود میں لانے اور کسی چیز کو ختم کر دینے کا اختیار، ان اسباب وعوامل کے ہاتھ میں نہیں دیا گیا ہے۔

ان فکری ونظری حقائق کی بنیاد پر جو علمی نتیجہ حاصل کیا جا سکتا ہے وہ یہ ہے کہ:

انسان کو اپنی عملی زندگی میں ان اسباب پر بالکلیہ بھروسہ نہیں کرنا چاہیے جو اس نے اپنے محدود علم کی بنیاد پر دریافت کیے اور فراہم کیے ہیں۔

وہ خود کو اس عالمِ کل کا ایک جزُ سمجھے اور ان اسباب وعوامل

کے زیرِ اثر جانے جو ماضی اور حال سے تعلق رکھتے ہیں۔

یعنی ——

اسے خدائے واحد سے اپنا تعلق جوڑنا چاہیے

جو، ہر چیز کا پیدا کرنے والا —— پرورش کرنے والا — اور تمام اسباب وعلل کو منظّم کرنے والا ہے۔

انسان کے لیے صحیح طرزِ فکر اور راہِ عمل یہی ہے کہ وہ سب سے کٹ کر پروردگارِ حقیقی سے رشتہ جوڑ لے۔

لیکن اس سے یہ مراد نہیں ہے کہ انسان ان اسباب وعلل کو جو اس نے اپنی فکری اور علمی صلاحیت کے ذریعہ فراہم کیے ہیں پسِ پشت ڈال کر ایک کونے میں بیٹھ جائے اور اپنے مقاصد کی تکمیل کے لیے کسی غیبی امداد کا منتظر رہے۔

کیونکہ: ——

پہلی بات تو یہ ہے کہ مدد کو پہنچنے والی کوئی غیبی طاقت اسباب و عِلل کے راستے ہی سے اثرانداز ہوتی ہے۔

دوسری چیز یہ پیشِ نظر رہے کہ جو بھی اسباب وعوامل انسان نے دریافت کیے ہیں وہ ایک مجموعۂ اسباب کا جزُ ہیں۔ ان اسباب کی تاثیر کا انکار کرنا اور مقصد کے حصول کی توقع رکھنا خود ایک جہالت ہے۔

انسان کے لیے صحیح راہِ عمل یہ ہے کہ

وہ اُن تمام اسباب و وسائل کو اپنے حصولِ مقصد کے لیے استعمال کرے جنھیں اس نے خداداد علم وشعور کی مدد سے دریافت کیا ہے۔

لیکن ——

اُن پر پوری طرح بھروسہ نہ کرے —— خود کو اس عالمِ کل کا ایک

غیر مستقل جُز سمجھے ———

اور ———

اپنا دل اس خدائے واحد سے لگائے جو تمام نتائج اور تاثیرات کا سرچشمہ ہے۔

یہ سارا مضمون اسی تعلیمِ دینی کا حصہ ہے جو اس بحث کا موضوع ہے۔

یہ دینی تعلیم ایک طرف انسان کو حقیقت بین اور حق شناس بناتی ہے تو دوسری طرف وہ اس میں اخلاقِ فاضلہ اور وہ بہترین صفات پیدا کرتی ہے جو حق شناسی کی بنیاد پر استوار ہوتی ہیں

جیسے ———

خوش اُمیدی ——— بُردباری ——— حوصلہ مندی ——— اور شجاعت جیسی صفات جو بالآخر انسان میں ایک ناقابلِ شکست قوّت پیدا کرتی ہیں ———؛

اسی طرح یہ دینی تعلیم انسان کو بُرے اخلاق، جاہلانہ اور ناشائستہ صفات سے دُور رکھتی ہے جیسے تکبّر، نخوت، خود پرستی اور خودستائی جیسی صفات جو اپنے آپ کو خود مختار اور مستقل بالذّات سمجھنے کا نتیجہ ہیں۔

اسی طرح رنج وحزن، بے تابی، بے چارگی، پست ہمتی اور نکماپن جیسی کیفیات جو مایوسی اور بے بسی کی حالت میں انسان کے اندر پیدا ہوتی ہیں۔

اگرچہ کہ اس بحث کو ہم نے ایک فلسفیانہ بحث کی صورت میں مکمل کیا ہے لیکن اس کا سارا مواد اور ہر جملہ آیاتِ قرآنی کے مضامین پر مبنی ہے۔ جو شخص بھی معارفِ قرآنی سے بہرہ مند ہے اس سے یہ بات مخفی نہیں ہو گی۔

۵

علمِ امام

سوال :-

حضرت سید الشہداء علیہ السّلام جب مکّہ سے کوفہ کے لیے روانہ ہوئے تو کیا انھیں اس بات کا علم تھا کہ وہ شہید کر دیے جائیں گے ؟
دوسرے الفاظ میں کیا امامؑ نے شہادت کے قصد سے عراق کا سفر کیا تھا یا ایسی عادلانہ حکومت کے قیام کے لیے یہ سفر کیا تھا جو صد فی صد اسلامی ہو ؟ -

جواب :-

اس سوال کا جواب یہ ہے کہ سیّد الشہداء علیہ السلام، شیعہ امامیہ کے عقیدے کے مطابق پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلّم کے جانشینوں میں سے تیسرے جانشین اور امامؑ ہیں۔ جن کی اطاعت فرض اور لازم ہے اور وہ ولایتِ کلیہ کے مالک ہیں اور غیب و شہود اور حوادث و واقعات کے بارے میں نقلی و عقلی دلائل کے مطابق، علمِ امامؑ دو قسم کا اور دو طریقوں پر ہے:

علمِ امامؑ کی پہلی قسم

امامؑ عالمِ وجود کے تمام حقائق سے اذنِ خداوندی کے ساتھ واقف ہوتا ہے خواہ وہ حقائق جو حس کے ذریعے محسوس کیے جا سکتے ہوں یا وہ حواس کے دائرے سے باہر ہوں ۔
جیسے آسمانی موجودات ، گزشتہ واقعات اور آئندہ کے واقعات۔

علمِ امامؑ کے لیے دلیل اور ثبوت

علمِ امام کے ثبوت میں کئی روایاتِ متواترہ موجود ہیں۔ جن کا ذکر شیعہ احادیث کے مجموعوں میں آیا ہے۔ جیسے کتابِ کافی اور بصائر اور کتبِ صدوق اور کتاب بحار الانوار وغیرہ ہیں۔
ان روایات کے مطابق جو بے حد وحساب ہیں، امامؑ کو عطائے الٰہی کی بنا پر علم اکتسابی نہیں بلکہ علم وہبی حاصل ہوتا ہے۔ اور وہ تمام چیزوں سے واقف اور آگاہ ہوتا ہے۔ اور امام اذنِ خداوندی سے جس چیز کے بارے میں بھی چاہے معمولی توجہ سے علم حاصل کر لیتا ہے ۔
البتہ قرآنِ کریم میں ایسی آیات موجود ہیں جو علمِ غیب کو ذاتِ خداوندی کے ساتھ مخصوص کرتی ہیں لیکن ایک آیت کریمہ میں یہ استثنیٰ موجود ہے :

"عَالِمُ الْغَيْبِ فَلَا يُظْهِرُ عَلَىٰ غَيْبِهِ أَحَدًا ۝ إِلَّا مَنِ ارْتَضَىٰ مِن رَّسُولٍ"۔ (سورۂ جن آیت ۲۶-۲۷)

یہ آیت بتاتی ہے کہ خدائے متعال کے ساتھ علمِ غیب کا اختصاص ان معنوں میں ہے کہ امورِ غیب کو مستقلاً اور خود سے بجز ذاتِ خداوندی کے اور کوئی نہیں جانتا۔ البتہ اس کے منتخب رسول علیہم السّلام تعلیمِ الٰہی کے ذریعہ امورِ غیب کو جان سکتے ہیں اور یہ بھی ممکن ہے کہ کچھ دوسرے خدا کے منتخب بندے پیغمبر کی تعلیم کے ذریعہ ان امورِ غیب سے واقفیت حاصل کرلیں جیسا کہ بہت سی روایات میں آیا ہے۔ پیغمبر اور ہر امام زندگی کے آخری لمحات میں امامت کا علم اپنے جانشین کو سونپتا ہے۔

عقلی دلائل کے مطابق امام اپنے نورانی مرتبے اور مقام کی بنا پر اپنے دور کا مکمل انسان ہوتا ہے اور اسماء وصفاتِ الٰہی کا کامل مظہر ہوتا ہے اور حقیقتاً تمام چیزوں کا علم رکھنے والا اور ہر شخصی واقعہ سے آگاہ ہوتا ہے اور اپنے وجودِ عنصری کے ساتھ وہ جس جانب بھی متوجہ ہوتا ہے اس پر حقائق روشن ہوجاتے ہیں۔

(چونکہ ان دلائل کا بیان پیچیدہ مسائل کے ایک سلسلے پر موقوف ہے اور ان کی سطح اس مقالہ کی سطح سے بلند ہے اس لیے ہم کسی دوسرے موزوں مقام پر ان کی وضاحت کریں گے)

عمل پر علمِ امام کا اثر اور فرائض سے اس کا تعلق

یہ نکتہ بھی قابلِ توجہ ہے کہ اس طرح کا علمِ وہبی جو عقلی ونقلی دلائل سے ثابت ہے کسی طرح بھی تغیّر پذیر اور قابلِ اختلاف نہیں ہے اور اس میں بال برابر بھی خطا اور غلطی نہیں ہوتی۔

اصطلاحاً یہ علم وہ ہے جو لوحِ محفوظ میں ثبت کیا گیا ہے اور یہ علم

اسی چیز سے آگاہی کا نام ہے جس کا تعلق حتمی خداوندی فیصلوں سے ہے۔

اس سلسلے میں یہ سمجھنا ضروری ہے کہ اس طرح کا علم انسان کے مکلف ہونے یعنی کسی فرض کی ادائیگی کا پابند بنانے سے تعلق نہیں رکھتا۔ اسی طرح اس علم کا تعلق کسی چیز کا ارادہ کرنے اور اسے مقصد بنانے سے بھی نہیں ہے۔

کیونکہ انسان کسی کام کو انجام دینے کا اسی وقت پابند ہوتا ہے جب کہ وہ کام اس کے حدِ امکان میں ہو، صرف ایسے کام ہی کے بارے میں انسان کو کرنے یا نہ کرنے کی ہدایت دی جاتی ہے جس کا انجام دینا اور انجام نہ دینا اس کے اختیار میں ہو ________

البتہ ________

کسی بات کا واقع ہونا ضروری ہو اور اس کا تعلق خدا کے اٹل فیصلوں سے ہو ________ تو یہ وہ مقام ہے ___

جو کسی ادائے فرض کے لیے موقع قرار پا سکتا ہے۔

مثلاً خدا اپنے بندے کو کسی ایسے کام کے کرنے یا نہ کرنے کا حکم تو دے سکتا ہے جو اس کے (بندے) امکان واختیار میں ہو،

لیکن اس کا کسی ایسے کام کے کرنے یا نہ کرنے کا حکم دینا محال ہے جو اُس (خدا) کی مشیت اور اس کے حتمی فیصلے کے مطابق لازماً وقوع پذیر ہوگا۔ اور کسی صورت میں نہیں ٹلے گا۔

کیونکہ ایسے کسی کام کے بارے میں خدا کی طرف سے اس کو اختیار دینا ایک بے نتیجہ بات ہوگی ________

اور اسی طرح، انسان کسی ایسے کام کو ہی اپنا مقصد اور ہدف بنا سکتا ہے جس کے انجام پانے اور نہ پانے کا امکان ہو۔ لیکن وہ کسی ایسے کام

کا نہ ارادہ کرسکتا ہے اور نہ اسے اپنا مقصد بناسکتا ہے جس کا واقع ہونا خدا کے فیصلوں کے تحت یقینی ہو کیونکہ کسی ایسے کام کا ارادہ کرنا یا نہ کرنا جو یقینی اور شدنی ہو اس پر ذرا بھی اثر انداز نہیں ہوسکتا۔ (غور کریں)

ہمارے اس بیان سے یہ بات پوری طرح واضح ہوجاتی ہے کہ :

(۱) —— امام کا یہ علم وہبی نہ اس کے اعمال پر کوئی اثر ڈالتا ہے اور نہ اس کے خاص فرائض سے تعلق رکھتا ہے اور اصولاً ہر ایسا لازمی کام جو خدا کے فیصلوں سے متعلق ہو اور جس کا واقع ہونا حتمی ہو وہ امر یا نہی سے یا انسانی ارادے اور مقصد سے تعلق نہیں رکھتا۔

حق تعالیٰ کی قطعی مشیت اور اس کا حتمی فیصلہ دراصل رضا بہ قضا کا مقام ہے جیسا کہ سید الشہداؑ نے اپنی زندگی کے آخری لمحات میں خاک اور خون کے درمیان کہا تھا :

" رضا بقضائك وتسليما لامرك لا معبود سواك "

اسی طرح مکہ سے روانگی کے وقت خطاب کرتے ہوئے آپؑ نے فرمایا تھا :

" رضا الله رضانا اهل البيت "

(۲) —— قضائے الٰہی کے تعلق سے دیکھا جائے تو کسی انسانی فعل کا حتمی ہونا اس کے اختیاری ہونے کے منافی نہیں ہے کیونکہ قضائے آسمانی نے اس فعل سے اس کی تمام

کیفیتوں اور نوعیتوں کے ساتھ تعلق پیدا کیا ہے نہ کہ مطلق فعل سے۔ مثلاً خدا نے چاہا کہ انسان کسی خاص اختیاری فعل کو اپنے ارادے و اختیار کے ساتھ انجام دے تو اس صورت میں اس اختیاری فعل کا انجام پانا حتمی اور ناقابل اجتناب ہے کیونکہ خدا کی مرضی یہی ہے کہ وہ فعل انجام پائے لیکن عین اس حال میں یہ فعل اختیاری بھی ہے اور انسان کے لیے اس کا انجام دینا ممکن بھی ہے۔ (غور کریں)

(۳) —— امامؑ کے اعمال کی ظاہری صورتیں جن کی ظاہری اسباب و علل سے مطابقت ہوسکتی ہے، انھیں اس بات کی دلیل نہیں بنانا چاہیے کہ امامؑ کو یہ وہبی علم حاصل نہیں تھا اور وہ حقائق و واقعات سے بے خبر تھے جیسے کہ یہ کہا جائے کہ اگر سید الشہداؑ کو حقیقت کا علم تھا تو انھوں نے مسلم کو اپنا نمائندہ بنا کر کوفہ کیوں روانہ کیا ؟ کس لیے انھوں نے صیداوی کی معرفت اہل کوفہ کے نام خط لکھا ؟ وہ کیوں مکہ سے کوفہ روانہ ہوئے ؟ انھوں نے خود کو کیوں ہلاکت میں ڈالا ؟ حالانکہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے :

" وَلَا تُلْقُوا بِأَيْدِيكُمْ إِلَى التَّهْلُكَةِ "

(سورہ بقرہ آیت ۱۹۵)

ان تمام سوالات کے جواب کے لیے وہ نکتہ کافی ہے جس کا ہم نے اوپر

ذکر کیا ہے، یہاں اسے دہرانے کی ضرورت نہیں۔

علمِ امامؑ کی دوسری قسم، عام علم

نصِ قرآنی کی رو سے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور امامؑ جو پیغمبرؐ کے پاک خانوادے سے ہیں، تمام انسانوں کی طرح وہ بھی بشر میں سے ہیں۔

امام اپنی زندگی کے دوران جو بھی کام انجام دیتا ہے وہ دوسرے تمام انسانوں کی مانند علمِ عمومی کی بنا پر اور خدا کے دیے ہوئے ارادہ واختیار کی بنا پر انجام دیتا ہے۔ اور وہ دوسروں کی طرح کسی بھی کام کے نفع ونقصان کا تعین اس علمِ عمومی کی بنا پر کرتا ہے جو تمام انسانوں کو خدا کی طرف سے دیا گیا ہے۔ اور پھر وہ جس اقدام کو بھی مناسب سمجھتا ہے اسے روبعمل لاتا ہے اور اس کی تکمیل کے لیے جدوجہد کرتا ہے اور جہاں بھی اسباب و عوامل اور ظاہری حالات اس کا ساتھ دیتے ہیں اسے اپنی جد وجہد میں کامیابی حاصل ہوتی ہے، اور جہاں وسائل واسباب سازگار نہیں ہوتے وہاں اس کی پیش قدمی رک جاتی ہے۔

(اگرچہ کہ امام اذنِ خداوندی کی بنا پر تمام واقعات کی
جزئیات سے واقف ہوتا ہے اور واقف رہے گا لیکن
اس کا یہ علم اس کے اختیاری اعمال پر ذرا بھی اثرانداز
نہیں ہوتا جیسا کہ پہلے بیان کیا جاچکا ہے)

امامؑ دوسرے تمام انسانوں کی طرح خدا کا بندہ ہوتا ہے اور ان فرائض و واجبات کا پابند ہوتا ہے جو دین کی رو سے عائد ہوتے ہیں اور خدا کی طرف سے اسے پیشوائی اور سرپرستی کا مقام حاصل ہوتا ہے۔ وہ اپنے اس

مقام ومرتبے کی ذمہ داریوں کو عام انسانی معیار کے ساتھ انجام دیتا ہے اور کلمۂ حق کو بلند کرنے اور دین وآئین کی حفاظت کے لیے انتہائی کوشش اور جدوجہد کرتا ہے۔

سیّد الشہداءؑ کی تحریک اور اسکا مقصد

اس دور کے عام حالات کا ایک مختصر جائزہ لے کر ہم سیّد الشہداءؑ کے عزم واقدام کی حقیقت ونوعیت کو واضح طور پر سمجھ سکتے ہیں۔

معاویہ کا بیس ۲۰ سالہ دورِ حکومت خانوادۂ رسالت اور ان کے ماننے والوں کے لیے ایک تاریک ترین دور ثابت ہوا۔ معاویہ نے ہر طرح کے مکر وفریب سے خلافتِ اسلامی کی باگ ڈور اپنے ہاتھ میں لے لی اور اپنا اقتدارِ مطلق وسیع مملکتِ اسلامیہ پر مسلّط کردیا اور اپنی زبردست طاقت اپنے اقتدار کو مستحکم کرنے اور اہلِ بیتؑ کو نابود کرنے پر صرف کردی۔

نہ صرف انھیں نابود کرنے کی کوشش کی ——

بلکہ یہ چاہا ——

کہ اُن کا نام تک کوئی نہ لے اور ان کی یاد تک لوگوں کے ذہنوں سے محو ہوجائے۔

معاویہ نے اصحابِ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ایک جماعت کو جس کا لوگ بے حد احترام کرتے تھے ہر طریقے وتدبیر سے کام لے کر اپنے ساتھ ملا لیا ——

اس دور میں احادیث گھڑی گئیں اور ان میں ملاوٹ کی گئی تاکہ اس سے صحابہ کو فائدہ پہنچے اور اہلِ بیتؑ کو نقصان۔

معاویہ کے حکم سے تمام بلادِ اسلامیہ میں منبروں پر امیرالمومنینؑ پر لعن وطعن کیا جاتا اور یہ کام ایک فریضۂ دینی کے طور پر بجالایا جاتا۔

معاویہ نے اپنے حامیوں کی مدد سے جن میں زیاد بن ابیہ اور سمرۃ بن جندب اور بسر بن ارطاۃ جیسے لوگ شامل تھے ہر جگہ اہل بیتؑ کے دوستوں کا سراغ لگا کر ان کی زندگیوں کا چراغ گل کر دیا اور اس مقصد کے لیے زر، زور، ترغیب و دھمکی سے انتہائی حد تک کام لیا۔

ایسے حالات میں قدرتی طور پر بات اس حد تک پہنچی کہ عام لوگوں نے علیؑ اور آلِ علیؑ کا نام لینے سے احتراز کرنا شروع کر دیا۔ اور جو لوگ اہل بیتؑ کی دوستی کا ذرا بھی درد اپنے دل میں رکھتے تھے وہ اپنی جان، مال اور آبرو بچانے کے لیے اہل بیتؑ کے ساتھ اپنے ہر طرح کے رابطے کو منقطع کرنے پر مجبور ہو گئے۔

اس بات سے یہ حقیقت بخوبی واضح ہو جاتی ہے کہ سیدالشہداءؑ کی امامت کا دور تقریباً دس سال تک جاری رہا۔ اس ساری مدت میں (بجز چند آخری مہینوں کے) امامؑ، معاویہ کے معاصر تھے اور وہ وقت کے امام اور معارفِ دین و احکامِ دین کے شارح اور مفسر تھے۔ لیکن اس ساری مدت میں پوری فقۂ اسلامی میں آپ سے ایک حدیث بھی روایت نہیں کی گئی۔ (مراد ایسی روایت سے ہے جسے لوگوں نے آپ سے نقل کیا ہو نہ کہ وہ روایت جو آنحضرتؐ کے خاندان میں موجود رہی اور بعد کے ائمہ کے ذریعہ پہنچی۔)

اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ——

اس زمانے میں اہل بیت علیہم السلام کا دروازہ ——

بالکلیہ طور پر بند کر دیا گیا تھا ——

اور ——

لوگوں کا ان سے ملنا اور رجوع کرنا صفر کی حد تک پہنچ گیا تھا۔ ——

اسلامی دنیا میں گھٹن اور دباؤ کی فضا روز بروز بڑھتی چلی گئی۔ اس صورتِ حال نے امام حسنؑ کو جنگ یا معاویہ کے خلاف کھڑے ہونے کی اجازت نہ دی اور پھر اس وقت اس کا کوئی فائدہ بھی نہ تھا۔

کیونکہ سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ معاویہ نے امام حسنؑ سے بیعت لے لی تھی اور بیعت کی موجودگی میں کوئی شخص آپ کی ہمراہی اختیار نہ کرتا تھا۔

دوسری بات یہ تھی کہ ——

معاویہ نے خود کو پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے صحابۂ کبارؓ میں سے ایک صحابی اور کاتبِ وحی —— اور —— تینوں خلفائے راشدین کے معتمد اور دستِ راست کی حیثیت سے متعارف کرایا ——

اور "خال المومنین" کا لقب —— ایک مقدس لقب کے طور پر اختیار کر لیا تھا۔

تیسرے یہ کہ ——

اپنے خاص حیلہ و فن کے ذریعہ بڑی آسانی کے ساتھ امام حسنؑ کو خود آپ کے اپنے آدمیوں کے ہاتھوں شہید کرا دیا۔ اور بعد میں معاویہ نے آپ کے خون کا بدلہ لینے اور آپ کے قاتلوں سے انتقام لینے کی بات کی اور خود مجلسِ عزا برپا کی اور عزاداری کا اہتمام کیا۔

معاویہ نے امام حسنؑ پر زندگی کا دائرہ اس قدر تنگ کر دیا تھا کہ انھیں خود اپنے گھر کے اندر سکون اور چین میسر نہ تھا۔ آخر کار جب معاویہ نے یزید کے لیے لوگوں سے بیعت لینی چاہی تو آنحضرت کو خود ان کی بیوی کے ہاتھوں

زہر دے کر شہید کرا دیا۔

خود سید الشہداؑ، جنھوں نے معاویہ کی موت کے بعد یزید کے خلاف اٹھ کھڑے ہونے میں ذرا بھی دیر نہ کی تھی

اور خود کو ——— اپنے ساتھیوں کو ———

——— اور اپنے شیر خوار بچے کو بھی اس راہ میں قربان کر دیا تھا۔ اپنی امامت کی اس ساری مدت میں جو حکومتِ معاویہ کی معاصر تھی، اس فداکاری پر قادر نہ ہو سکے تھے۔ اس لیے کہ معاویہ کی سیاست کے مقابل جو بظاہر حق بجانب نظر آتی تھی اور آپ سے لی گئی بیعت کی بنا پر معاویہ کے خلاف اٹھ کھڑا ہونا اور شہادت پیش کرنا ذرا بھی نتیجہ خیز نہیں ہو سکتا تھا۔

یہ اس ناگوار صورت حال کا مختصر سا تذکرہ تھا جو معاویہ نے اسلامی دنیا میں اس وقت پیدا کر رکھی تھی اور جس نے پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے گھر کے دروازے کو کلی طور پر بند کر دیا تھا اور اہل بیتؑ کے ہر طرح کے اثر و رسوخ کو زائل کر رکھا تھا۔

معاویہ کی وفات اور یزید کی خلافت

معاویہ نے پیکرِ اسلام اور مسلمانوں پر جو آخری کاری ضرب لگائی وہ یہ تھی کہ خلافتِ اسلامی کو ایک استبدادی اور موروثی سلطنت میں تبدیل کر دیا اور اپنے بیٹے یزید کو اپنا جانشین بنا دیا۔ حالانکہ یزید نمود و نمائش ہی کے لیے سہی کوئی دینی شخصیت نہیں رکھتا تھا اور وہ اپنا سارا وقت علانیہ طور پر بادہ و رباب اور عشق بازی اور بندروں کے نچانے میں صرف

کرتا تھا اور دینی ضوابط و آداب کا کوئی احترام نہ کرتا تھا۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ دین و آئین پر اس کا کوئی اعتقاد نہ تھا۔

چنانچہ جب اہل بیت کے قیدیوں اور شہدائے کربلا کے سروں کو دمشق میں لایا گیا اور وہ انھیں دیکھنے کے لیے باہر آیا تو ایک کوّے کی آواز اس کے کان میں پہنچی تو بولا:

نعب الغراب فقلت قل او لا تقل
فقد اقتضیت من الرسول دیونی [۱]

اسی طرح جس وقت اہل بیت کے قیدیوں کو اور سید الشہداؑ کے مقدس سر کو اس کے سامنے لایا گیا تو اس نے کچھ اشعار پڑھے۔ ان میں سے ایک شعر یہ تھا:

لعب هاشم بالملك فلا
خبر جاء ولا وحی نزل [۲]

یزید کا برسرِ اقتدار آنا اور اس کے ساتھ معاویہ کی سیاست کا جاری رہنا اسلام اور مسلمانوں کی ذمہ داری کو بخوبی واضح کر رہا تھا اور یہ چیز اہلبیتؑ کے ساتھ مسلمانوں اور ان کے طرفداروں کے رابطے کو بھی اچھی طرح ظاہر کر رہی تھی۔

ان حالات میں اہل بیتؑ کے سقوط اور حق و حقیقت کی بنیاد کو اکھاڑ پھینکنے

---

[۱] آلوسی سے نقل کیا گیا جز ۲۴ تفسیر روح المعانی صفحہ ۳۴ تاریخ ابن الوردی اور کتاب وافی الوفیات سے۔ ایک کوّے نے آواز بلند کی۔ میں نے کہا۔ تو بول یا نہ بول میں نے اپنا قرض پیامبر سے وصول کر لیا۔

[۲] بنی ہاشم نے سلطنت کے ساتھ کھیلا ہے۔ نہ کوئی خبرِ آسمانی آئی اور نہ کوئی وحی نازل ہوئی۔

کی واحد تدبیر اور مؤثر ترین اقدام یہی ہوسکتا تھا کہ سید الشہداؑ یزید کے ہاتھ پر بیعت کرلیں اور اسے خلیفہ اور پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا قابلِ اطاعت جانشین مان لیں۔

امامؑ اور یزید کے ساتھ بیعت

سید الشہداؑ اس حقیقی امامت اور پیشوائی کی بنا پر جو انھیں حاصل تھی یزید کے ہاتھ پر بیعت نہیں کرسکتے تھے اور وہ دین و آئین کو پائمال کرنے والا ایسا قدم نہیں اُٹھا سکتے تھے۔ ان کا فریضہ بیعت سے انکار کرنے کے سوا اور کچھ نہیں تھا اور خدا بھی ان سے بجز اس کے اور کچھ نہیں چاہتا تھا۔

بیعت سے انکار کے اثرات

سید الشہداؑ کی طرف سے بیعت سے انکار کے تلخ اور ناگوار اثرات رونما ہوئے کیونکہ اپنے وقت کی ہولناک طاقت جو اپنی مخالفت کو برداشت نہیں کر سکتی تھی، اپنی پوری قوت کے ساتھ بیعت کا مطالبہ کر رہی تھی،

وہ بیعت چاہتی تھی ——— یا پھر ———

سید الشہداؑ کا سر ———

وہ اس سے کم کسی چیز پر راضی نہ تھی،

بیعت سے انکار کی صورت میں امامؑ کا شہید ہوجانا ایک امرِ قطعی تھا، بیعت سے انکار اور شہادت دونوں لازم و ملزوم ہوچکے تھے۔

سید الشہداؑ نے اسلام اور مسلمانوں کی مصلحت اور مفاد کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے، بیعت نہ کرنے کا اور شہید ہوجانے کا عزم کرلیا اور بے خطر موت

کو زندگی پر ترجیح دی۔ خدا کی طرف سے ان پر جو فریضہ عائد ہوتا تھا وہ یہی تھا کہ بیعت سے انکار کردیں اور شہادت کی راہ اختیار کریں۔

(بعض روایات میں یہ جو آیا ہے کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے آپؑ سے خواب میں فرمایا کہ خدا انھیں شہید دیکھنا چاہتا ہے اس کا مطلب بھی یہی ہے۔ خود سید الشہداؑ نے بعض ان لوگوں سے جو آپؑ کو یزید کے خلاف کھڑے ہونے سے منع کر رہے تھے، فرمایا تھا۔ خدا مجھے اپنی راہ میں شہید دیکھنا چاہتا ہے۔ اس سے مراد اللہ تعالیٰ کی مشیتِ تشریعی ہے نہ کہ مشیتِ تکوینی۔ جیسا کہ ہم نے بیان کیا خدا کی مشیتِ تکوینی ارادہ و فعل پر کوئی اثر نہیں ڈالتی۔)

زندگی پر موت کو ترجیح

بلاشبہ سید الشہداؑ نے بیعت سے انکار اور نتیجتہً شہید ہونے کا عزم کرلیا اور موت کو زندگی پر ترجیح دی، بعد کے حوادث نے بھی یہ ثابت کر دیا کہ آپؑ کا فیصلہ درست تھا۔

آپؑ کی شہادت جن دل خراش حالات میں ہوئی ———

اس نے ———

اہل بیتؑ کی مظلومیت اور حقانیت کی تصدیق کردی ———

آپؑ کی شہادت کے بعد ———

بارہ سال تک تحریکوں اور جنگوں کا سلسلہ جاری رہا۔ اس کے بعد وہی گھر جس کے دروازے پر سید الشہداؑ کی زندگی میں کوئی نہیں جاتا تھا———

امام پنجمؑ کے زمانے میں، ایک مختصر وقفے کے بعد ——
مرجع و مرکز بن گیا ——
اور شیعہ اطراف واکناف سے ایک سیلاب کی طرح اسی گھر کے دروازے کا رُخ کرتے رہے۔
اس دن کے بعد سے ——
اہل بیتؑ کے طرفداروں کی تعداد میں روز بروز اضافہ ہوتا رہا۔
اور ——
ان کی حقانیت و نورانیت دنیا کے ہر گوشے میں اپنی روشنی پھیلانے لگی اور اس کا پایہ مضبوط ہوتا چلا گیا۔
حقانیت ——
اہل بیتؑ کی مظلومیت کے ساتھ ہے ——
اور اس میدان کے پیشرو سید الشہداءؑ ہیں۔

آپؑ کے زمانے میں خاندانِ رسالت جس صورتِ حال سے دوچار تھا اور اہلبیتؑ کی طرف لوگوں کا جو رجوع تھا آج اس کا موازنہ آپؑ کی شہادت کے بعد چودہ سو سال کے دوران پیدا ہونے والے حالات سے کیا جائے جو سال بہ سال تازہ تر اور عمیق تر ہوتے جا رہے ہیں تو سید الشہداءؑ کی نظر اور ان کے فیصلے کی صحت اور زیادہ روشن اور واضح ہو جاتی ہے۔

ایک شعر جو بعض روایات کے مطابق آپؑ نے پڑھا تھا اسی مطلب کی ترجمانی کرتا ہے:

وما ان طبنا جبن ولكن
منايانا و دولت آخرينا

یہی سبب تھا کہ معاویہ نے یزید کو بڑی تاکید کے ساتھ وصیت کی تھی کہ اگر حسین ابن علیؑ نے بیعت سے انکار کیا تو انھیں ان کے حال پر چھوڑ دے اور کسی طرح سے ان پر معترض نہ ہو ——
معاویہ نے یہ مشورہ اخلاص و محبت کی بنا پر نہیں دیا تھا ——
دراصل معاویہ کو معلوم تھا کہ ——
حسین ابن علیؑ کسی صورت میں بیعت نہیں کریں گے اور اگر وہ یزید کے ہاتھوں قتل ہوئے تو ——
اہل بیتؑ کو مظلومیت کا نشان مل جائے گا ——
اور یہ چیز ——
اموی سلطنت کے لیے خطرناک —— اور —— اہل بیتؑ کے لیے تبلیغ اور پیش قدمی کا بہترین ذریعہ ثابت ہوگی۔

اپنی ذمّہ داری کی طرف

امامؑ کے مختلف ارشادات

سید الشہداءؑ خدا کی طرف سے عائد ہونے والے فریضے سے جو بیعت سے انکار کا فریضہ تھا اچھی طرح واقف تھے اور آپؑ نے سب سے زیادہ بہتر طور پر بنی امیہ کی بیکراں طاقت اور یزید کی نفسیات کو سمجھ لیا تھا اور آپ جانتے تھے کہ بیعت سے انکار کا لازمی نتیجہ شہادت کی صورت میں ظاہر ہوگا ——
اور آپؑ کو یہ معلوم تھا کہ ——
خود کو شہادت کے لیے پیش کرنا خدا کی طرف سے عائد ہونے والا ایک اہم فریضہ ہے۔

سیّد الشہداءؑ نے یہ بات مختلف مقامات پر گوناگوں تعبیرات کے ساتھ ظاہر کی ہے۔

حاکمِ مدینہ کی مجلس میں جو آپؑ سے بیعت کا مطالبہ کر رہا تھا۔
آپؑ نے فرمایا:

"مجھ جیسا آدمی یزید جیسے آدمی کے ہاتھ پر بیعت نہیں کرے گا۔"

جس رات آپؑ مدینہ سے روانہ ہوئے آپؑ نے اپنے نانا رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد نقل کرتے ہوئے کہا:

"رسولِ اکرمؐ نے مجھ سے خواب میں فرمایا خدا کی مرضی یہ ہے کہ تو اُس کی راہ میں (ایک فریضے کو پورا کرتے ہوئے) قتل ہو۔"

مکّہ سے روانہ ہوتے وقت، ان لوگوں کے جواب میں جو آپ کو جانے سے روک رہے تھے، خطبہ دیتے ہوئے آپؑ نے اسی مضمون کا اعادہ فرمایا:

کوفہ کی طرف سفر کے دوران راستے میں ایک شخص کے اس اصرار کے جواب میں کہ

"آنحضرت کوفہ جانے کا ارادہ ترک کر دیں ورنہ قتل کر دیے جائیں گے۔"

فرمایا:

"یہ بات مجھ سے پوشیدہ نہیں ہے لیکن یہ لوگ مجھ سے دست بردار ہونے والے نہیں ہیں، میں جہاں بھی جاؤں اور جہاں بھی رہوں یہ مجھے ضرور قتل کر دیں گے۔"

ان روایات میں سے بعض میں اختلاف پایا جاتا ہے یا وہ سند کی رو سے ضعف سے خالی نہیں ہیں لیکن اس وقت کے حالات کا جائزہ اور ان کا تحلیل وتجزیہ پوری طرح ان کی تائید کرتا ہے۔

اپنی مدّتِ قیام کے دوران امامؑ کے مختلف رویے

ہم جو یہ کہتے ہیں کہ امامؑ کے یزید کے خلاف اٹھ کھڑے ہونے کا مقصد شہادت تھا اور خدا کو آپؑ کی شہادت مقصود تھی تو اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ خدا نے آپؑ سے یہ چاہا تھا کہ یزید کے ہاتھ پر بیعت کرنے سے انکار کر دیں اور پھر ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ جائیں اور یزید کے لوگوں کو اس کی اطلاع کر دیں کہ وہ آئیں اور آکر قتل کر دیں اور اس مضحکہ خیز طریقے سے اپنے فریضے کو انجام دیں اور اپنے اس عمل کو حق کے لیے قیام کا نام دے دیں بلکہ

اس کا اصل مطلب یہ ہے کہ ——

یزید کی بدترین خلافت کے خلاف کھڑا ہونا امام کا فرض تھا

اور ان کا یہ فرض تھا کہ ——

بیعت سے انکار کر دیں اور اس انکار کو جو شہادت پر منتج ہوگا ہر طریقے سے تکمیل کو پہنچائیں۔

یہی وجہ ہے کہ ——

اپنی مدتِ قیام کے دوران ——

حالات وکوائف میں تبدیلی کے ساتھ ساتھ امامؑ کا رویہ بھی مختلف صورتیں اختیار کرتا رہا۔

ابتدا میں جب امامؑ پر حاکم مدینہ کا دباؤ بڑھ رہا تھا تو آپؑ ایک رات مدینہ سے مکہ کی طرف روانہ ہو گئے جو خدا کا حرم اور دین کا مرکز تھا۔ یہاں آپؑ نے پناہ لی اور مکہ میں پناہ گزینی کے چند ماہ گزارے۔

مکہ میں حکومت کے جاسوس آپؑ کی نگرانی کرتے رہے یہاں تک کہ موسمِ حج کے دوران ایک گروہ کو بھیج کر اس کے ہاتھوں آپؑ کو قتل کرانے کا یا گرفتار کر کے شام بھیجنے کا فیصلہ کر لیا گیا۔

دوسری جانب عراق سے خطوط کا ایک سیلاب آپ کی جانب آنے لگا سینکڑوں اور ہزاروں خطوط آپ کے پاس بھیجے گئے جن میں آپ کا ساتھ دینے کا اور مدد کرنے کا وعدہ کیا گیا تھا ——

اور آخری خط جیسا کہ بعض مورخین نے لکھا ہے ——

اتمامِ حجت کے طور پر ——

اہلِ کوفہ کی طرف سے آپؑ کے پاس پہنچا ——

اس کے بعد امام نے کوفہ کی طرف روانہ ہونے کا اور ایک خونین جدوجہد کا فیصلہ کر لیا ——

سب سے پہلے آپؑ نے مسلم بن عقیل کو اپنا نمائندہ بنا کر اتمامِ حجت کے طور پر روانہ کیا۔

کچھ دن بعد مسلم کا پیغام وصول ہوا جس میں حالات کے سازگار ہونے کی اطلاع دی گئی تھی ——

امامؑ نے دو وجوہ سے کوفہ کا رُخ کیا —— ایک شام کے جاسوسوں کی آمد، جن کا مقصد —— آپؑ کو قتل کرنا تھا یا گرفتار کرنا تھا۔ دوسرے خانۂ خدا کی حرمت کی حفاظت اور اہلِ عراق کا آپؑ کے ساتھ تعاون کے لیے آمادہ ہونا۔

بعد میں سفر کے دوران جب مسلم اور ہانی کے قتل کی خبر پہنچی تو آپؑ نے حملہ آورانہ جنگ کی روش کو دفاعی جدوجہد میں تبدیل کر دیا اور اپنی جماعت کی تربیت میں مصروف ہو گئے اور صرف ان لوگوں کو اپنے ساتھ لے کر منزلِ مقصود کی طرف روانہ ہو گئے جو اپنا آخری قطرۂ خون بہنے تک آپؑ کا ساتھ دینے کا عزم رکھتے تھے۔

سوال : علمِ امامؑ کیا ہے اور اس کی حد کہاں تک ہے؟ کیا امام کو اپنی موت کا علم ہوتا ہے کہ وہ کس طرح اور کس طریقے پر قتل کیے جائیں گے؟ کیا انھیں اپنی شہادت کی ساعت اور شہادت کی شب یا دن کا بھی علم ہوتا ہے؟

جواب : اکثر روایات کے مطابق امام کو قربِ خداوندی کا ایسا مقام حاصل ہے کہ وہ جو بھی چاہے خدا کے اِذن سے جان سکتا ہے، اس میں اس کی اپنی موت اور شہادت اس کی تمام تفصیلات وجزئیات کا علم بھی شامل ہے۔ اس میں کوئی بات عقل کے خلاف نہیں ہے اور شریعت کی راہ سے بھی ایسی روایات ملتی ہیں کہ ائمہؑ میں سے ہر ایک امامؑ خدا کی طرف سے ایک لوح رکھتا ہے جس میں اس کے خاص فرائض درج ہوتے ہیں اس کے ساتھ ائمہ علیہم السلام ظاہر کی حفاظت اور زندگی کی راہ و رسم کے بارے میں اپنی کچھ ذمہ داریاں رکھتے ہیں۔

اس جواب سے یہ شبہ ابھرتا ہے کہ خود کو خطرے میں ڈالنا خلافِ عقل ہے انسان کسی ایسے کام میں ہاتھ نہیں ڈالتا جس میں اسے قطعی طور پر اپنی جان کا خطرہ نظر آتا ہے اور وہ اپنی عقل کی ہدایت پر عمل کرتے ہوئے ایسے پُرخطر کام سے دور رہتا ہے تو پھر کس طرح امامؑ جو تمام عقل مندوں سے زیادہ عقل مند ہوتا ہے ایسے

کام میں ہاتھ ڈال سکتا ہے جس کے بارے میں اسے معلوم ہے کہ اس کا انجام موت اور شہادت ہے۔

اصولی طور پر انسان کوئی ایسا اقدام نہیں کرتا جس میں اسے قطعی خطرہ نظر آتا ہے، تو پھر یہ کس طرح ہو سکتا ہے کہ امامؑ خود کو اپنے ارادے اور اختیار سے موت کے منہ میں دے دے اور عالمِ انسانیت کو اپنے وجود کی برکات سے محروم کردے؟

اس سوال کا جواب یہ ہے:

کسی پُرخطر کام میں جانتے بوجھتے ہاتھ ڈالنا خلافِ عقل محض اس لیے قرار دیا جاتا ہے کہ انسان ہر کام اپنے فائدے کے لیے کرتا ہے اور جس کام میں خود اس کی جان کے لیے خطرہ ہو تو وہ اسے انجام دینے سے احتراز کرتا ہے ——

لیکن اگر وہ کسی کام کو ——

اپنی زندگی سے زیادہ اہم قرار دے ——

تو —— یقیناً وہ اس کام کو انجام دے گا اور اسے اپنی جان کے چلے جانے کا کوئی خوف نہ ہوگا۔

اس کے ثبوت میں انقلابات کی —— اور —— تحریکوں کی سینکڑوں مثالیں دی جا سکتی ہیں ——

اس کا زندہ ثبوت ——

واقعۂ کربلا —— اور —— تحریکِ حسینی ہے۔

اب آپ یہ فرض کر لیتے ہیں کہ سید الشہداءؑ کا اقدامِ شہادت اختیاری نہیں تھا تو آپ ان تمام شہدائے کربلا کے بارے میں کیا کہیں گے جنھوں نے امامؑ کے مزید چند گھنٹوں کے لیے زندہ رہنے کو اپنی زندگی سے زیادہ اہم تر چیز

قرار دیا تھا اور یکے بعد دیگرے خود کو موت کے منہ میں جھونکتے رہے اور شہید ہو گئے۔

اس سے یہ بات پوری طرح واضح ہو جاتی ہے کہ جو کچھ شبہ ظاہر کیا گیا ہے وہ بے بنیاد ہے ——

اور یہ کہنا صحیح نہیں ہے کہ ——

انسان کسی ایسے کام میں ہاتھ نہیں ڈالتا جس کا پُرخطر ہونا اسے قطعی طور پر معلوم ہو ——

اللہ تعالیٰ نے اپنے کلامِ مجید میں فرعون اور فرعونیوں کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا:

"وَجَحَدُوا بِهَا وَاسْتَيْقَنَتْهَا أَنفُسُهُمْ"

(سورہ نمل آیت ۱۴)

ترجمہ: انھوں نے آیاتِ الٰہی کو ظلم و سرکشی کی بنا پر رد کیا۔ درآنحالیکہ وہ اس پر یقین رکھتے تھے۔

انھوں نے موسیٰؑ کی دعوت اور معجزات کا انکار کیا حالانکہ انھیں ان کی صحت و حقانیت کا یقین تھا۔ آیتِ قرآنی کے مطابق انھیں اپنے کفر اور انکار کی صورت میں اپنی قطعی ہلاکت کا یقین تھا اس کے باوجود انھوں نے کفر کی راہ اختیار کی۔

یہ کہنا کہ امامؑ کس طرح اپنے ارادے اور اختیار سے خود کو موت کے حوالے کر سکتے ہیں اور عالمِ انسانیت کو اپنے بابرکت وجود سے محروم کر سکتے ہیں؟ ایک بے سروپا بات ہے۔

کیونکہ امامؑ جانتے تھے کہ زندگی کے مقابل شہادت کو کس قدر اہمیت

حاصل ہے اور انھوں نے زندگی پر شہادت کو ترجیح دی۔

کسی مسلمان بلکہ کسی بھی باشعور انسان کو شہادتِ حسینی کے ان حیرت انگیز اثرات سے غفلت نہیں برتنی چاہیے جو گزشتہ چودہ سو سال کے دوران عالمِ اسلام پر اور خصوصاً عالمِ تشیع پر مرتب ہوتے رہے ہیں۔

حدیثِ متواتر ثقلین کے مطابق سید الشہداءؑ کو خاندانِ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں معلّمِ مسائل کا مقام حاصل ہے ———

لیکن ———

تمام وسیع اسلامی فقہ میں آپؑ سے ———

ایک حدیث بھی نقل نہیں کی گئی۔[1]

بلاشبہ بعض دانشمندوں نے لکھا ہے کہ انھوں نے ———

——— ایک حدیث تلاش کرلی ہے ———

جو سید الشہداءؑ سے روایت کی گئی ہے ——— گویا حضرت سید الشہداءؑ کی امامت کے دس سالہ عرصے کا حاصل ———

——— بس یہ ایک حدیث ہوئی ؟

---

[1] سید الشہداءؑ سے مسائلِ فقہی میں جو روایات نقل کی گئی ہیں وہ شیعہ سلسلے سے نقل ہوئی ہیں لیکن یہ وہ روایات ہیں جو دوسرے ائمہؑ جیسے حضرت صادق اور حضرت موسیٰ بن جعفر اور حضرت رضا علیہم السلام کی روایت سے پہنچی ہیں " عن الصادق عن ابیہ عن ابائہ عن علیؑ و عن النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم " ہماری مراد ان روایات سے ہے جو ائمہؑ کے علاوہ کسی اور نے آنحضرت سے براہِ راست نقل کی ہوں تاکہ ان سے لوگوں کا آپ کی طرف رجوع ثابت ہو۔

اس سے یہ بات بخوبی معلوم کی جا سکتی ہے کہ معاویہ کی بیس سالہ حکومت کی پیدا کردہ صورتِ حال نے ———

پیغمبرِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے خاندان کے لیے ———

کس قدر ناگوار حالات پیدا کردیے تھے اور لوگ آنحضرتؑ سے کس قدر دور رہنے کی کوشش کرتے تھے ———

اور یہ کہ آپؑ نے کیسا تاریک دور گزارا تھا ——— !!

اب آپ امامؑ کی چند سالہ زندگی کے ———

ان حیرت انگیز اور زندہ اثرات کا اندازہ کریں ———

——— جو گزشتہ تقریباً تیرہ سو سال کے دوران عالمِ اسلام میں ظاہر ہوئے اور برابر ظاہر ہوتے جارہے ہیں اس کے بعد یہ شبہ دور ہوجانا چاہیے اور اس کا صحت وسقم واضح ہوجانا چاہیے ———

کہ امامؑ نے کس لیے شہادت کو قبول کیا ——— اور ——— عالمِ اسلام کو اپنے وجود کی برکات سے محروم کردیا ——— ؟

ان ساری وضاحتوں کے بعد بھی اگر یہی شبہ باقی رہے تو ———

سید الشہداءؑ سے پہلے ———

تقدیرِ خداوندی کے بارے میں یہ شبہ وارد ہوگا کہ کیوں اللہ تعالیٰ نے اس امامؑ کے لیے شہادت مقدّر فرمادی جس کی زندگی سے دنیا کو بڑا فیض حاصل ہوتا ——— ؟

اگر ہم اس جواب کو پسند نہ کریں ———

تو اس شبہ کا جواب بجز اس کے اور کیا ہوسکتا ہے کہ ———

خدائے تعالیٰ حکیمِ مطلق ہے ———

وہ بغیر حکمت و مصلحت کے کوئی کام نہیں کرتا۔

شہادتِ امامؑ کے بارے میں اس کی تقدیر نے جو فیصلہ کیا ——

دوسری تقدیرات کی طرح ——

وہ بھی حکمت سے خالی نہیں ہے اگرچہ کہ ہم اس کی حکمت اور مصلحت سے ناواقف ہوں۔

اس کے بعد بھی امامؑ کے بارے میں اسی شبہ کا اظہار کیا جاتا ہے تو اس کا جواب وہی ہوگا ——

اس لیے کہ ——

امامؑ خدا کی حکمت کا مظہر ہے اور وہ ہرگز کوئی ایسا کام نہیں کرتا جو حکمت و مصلحت سے خالی ہو۔

——— ☼ ———

٦

رابطۂ اعتقاد و اخلاق

اعتقاد ، خُلق ، عمل

ان تینوں کلمات کے لفظی معنوں سے ہم سب اچھی طرح واقف ہیں اور زندگی کے تجربات کے مطابق ان کلمات کے ہزاروں مطالب و مفاہیم بیان کیے گئے ہیں اور وہ ہماری نظروں سے گزر چکے ہیں ——

البتہ کچھ لوگ ایسے بھی ہو سکتے ہیں جو اختلافِ زبان کے سبب ان عربی کلمات کا مفہوم نہ سمجھتے ہوں لیکن وہ خود اپنی زبانوں میں ان کلمات کے مترادف الفاظ سے واقف ہیں۔

عقیدہ یا اعتقاد ——

کسی پر ایمان و یقین رکھنے اور اس کی تصدیق کرنے کا نام ہے۔

جیسے زمین کا سورج کے گرد سال بھر میں گردش کو مکمل کرنا اور اس کی اس گردش کی وجہ سے چار موسموں' بہار و خزاں اور گرمی و سردی کا وجود میں آنا ——

یا چنگیز خان کو ایک خونریز انسان کی حیثیت سے جاننا ——

یا پھر، مسلمانوں کا یہ ماننا کہ اس دنیا کو اور جو کچھ اس دنیا میں ہے

اسے اللہ تعالیٰ نے پیدا کیا ہے ——

اور یہ کہ ——

اس کائنات کا ایک ہی خالق ہے، زندگی اور زندگی کے جو بھی آثار نظر آتے ہیں اسی نے پیدا کیے ہیں۔

اسی طرح کے کچھ دوسرے عقائد ——

خُلق ——

ان خصوصیات کو کہتے ہیں جو انسان کے باطن میں اپنی جگہ بنالیتی ہیں اور اسے ارادہ و عمل پر آمادہ کرتی ہیں ——

جیسے ایک باہمت و باحوصلہ انسان ایک خاص باطنی صفت کا مالک ہوتا ہے اور ہر ایسے خطرے کا جم کر سامنا کرتا ہے جو قابلِ دفاع ہو اور جوش و جذبے کے ساتھ میدانِ مقابلہ میں اُتر کر اسے چیلنج کرتا ہے۔

اس کے برعکس ——

بزدل انسان کے باطن میں ایک ایسی صفت جاگزیں ہوتی ہے کہ جیسے ہی کوئی خطرہ سامنے آتا ہے اس کے اعصاب جواب دے دیتے ہیں اور وہ میدانِ معرکہ سے راہِ فرار اختیار کرنے پر آمادہ ہو جاتا ہے۔

ان صفات کا دوسرا نام شجاعت اور بزدلی ہے۔ ان دو طرح کے اخلاق میں سے ایک پسندیدہ ہے اور دوسرا ناپسندیدہ۔

غالباً ان دونوں میں سے ایک صفت ہمارے اندر موجود رہتی ہے۔

اس کے باوجود، آغازِ زندگی میں انسان کا باطن ان دونوں صفات سے خالی ہوتا ہے اور وہ پوری طرح اس کے مزاج میں اپنی جگہ نہیں بناتی ہیں۔

اس لیے ——

کسی حقیقی یا خیالی خطرات کے مواقع پر اس کی یہ اخلاقی کیفیت پوری طرح واضح نہیں ہوتی اور کبھی تو وہ بعض ناگوار حوادث کے مقابل استقامت کا مظاہرہ کرتا ہے اور کبھی ثابت قدمی پر فرار کو ترجیح دیتا ہے۔

عمل کے معنیٰ کام کے ہیں ———

یہ ان حرکات و سکنات کے مجموعہ کا نام ہے جو انسان پورے شعور و ارادے کے ساتھ کسی مقصد کے حصول کے لیے انجام دیتا ہے۔

قدرتی طور پر انسان کا ہر عمل سینکڑوں اور ہزاروں حرکات و سکنات کا مرکب ہوتا ہے۔ ان مختلف حرکات و سکنات میں جو چیز وحدت اور یگانگت پیدا کرتی ہے وہ مقصد اور ہدف ہے۔

اس کی مثال غذا کھانے کا عمل ہے ———

ہم اسے ایک عملِ واحد قرار دیتے ہیں۔ اگر ہم اس پر غور کریں تو بآسانی سمجھ سکتے ہیں۔

غذا کا ایک لقمہ کھانے کے لیے بہت زیادہ حرکات درکار ہوتی ہیں۔ جن کے لیے ہاتھ، منہ، حلق اور معدہ سب مل کر کام کرتے ہیں۔

بھوک کی آگ بجھانے کے لیے ایک مشترکہ عمل کی ضرورت ہوتی ہے جس کا مقصد سیر ہونا ہے۔ اس مقصد کے لیے انسان تمام متعلقہ اعضاء کو منظّم طریقے پر حرکت میں لاتا ہے اور اپنے اس عمل کو وہ "غذا کھانے" کا نام دیتا ہے۔

کوئی بھی عمل اسی وقت انجام پاتا ہے جب انسان اپنے ہاتھ پیر کام میں لاتا ہے اور مادی وسائل استعمال کرتا ہے۔

لیکن عمل کی ظاہری صورت کے پیچھے ایک باطنی عمل بھی جاری رہتا ہے جس کے نتیجے میں بیرونی حرکات و سکنات ایک منظّم عمل کی صورت اختیار

کرتی ہیں اور اس مقصد کو پورا کرتی ہیں جو انسان کے پیشِ نظر ہوتا ہے۔ مقصد کا تعین اور اس کے حصول کا ارادہ کرنا ایک ایسا داخلی عمل ہے جو بے شمار حرکات و سکنات کو وحدتِ عمل کی صورت عطا کرتا ہے۔

عمل کی ظاہری صورت قابلِ تغیّر و تبدّل ہے ———

جیسے کبھی انسان کچّا میوہ، سبزیاں اور کچا گوشت کھا کر اپنی ضرورت پوری کرتا تھا ———

پھر اس نے ترقی کی منزلیں طے کیں اور پکی ہوئی غذائیں کھانے لگا۔

اسی طرح ———

کبھی ہاتھ سے کھاتا تھا ———

اور اب چمچے اور کانٹے کی مدد سے کھانے لگا ہے۔

لیکن انسان کا داخلی عمل بغیر کسی تبدیلی کے بدستور باقی رہتا ہے یعنی ایک مقصد کے لیے مختلف اعضا سے کام لینا اور مختلف حرکات و سکنات کو ایک مقصدِ واحد کے لیے منظّم کرنا۔

انسان خواہ متمدن بن جائے یا پس ماندگی کی زندگی گزارے اگر اس نے غذا کے استعمال کرنے کے مقصد ہی کو فراموش کر دیا تو پھر وہ غذا کھانے کے عمل ہی کو ترک کر دے گا۔

اخلاق کس طرح پیدا ہوتے ہیں

ہم نے غذا کھانے کی مثال کا جو تجزیہ کیا ہے اس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ یہ مقصد ہی ہے جو ہر انسانی عمل میں انسان کے جذبات اور شعور کے ساتھ مل کر اپنی چمک دمک دکھاتا ہے۔

مقصد کے تعین کے بعد انسان ان وسائل کا جائزہ لیتا ہے جو حصولِ مقصد کے لیے ضروری ہوتے ہیں اور ان داخلی اور خارجی موانعات پر نظر ڈالتا ہے جو اس کے لیے رکاوٹ بن سکتے ہیں پھر مقصد کی نوعیت و ماہیت کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے مناسب اقدامات کا ایک سلسلہ شروع کرتا ہے۔

(جیسے غذا کھانے کے لیے پہلے ہاتھ کو پھر منہ کو اور پھر حلق کو استعمال کرے)

ضروری انتظامات کے بعد اپنے ہمت و ارادے سے کام لے کر جد و جہد کا آغاز کرتا ہے۔

کسی بھی خارجی عمل کے لیے ایک داخلی عمل ضروری ہوتا ہے۔ جو مقصد اور ہدف کے لیے کام کرنے کی آمادگی اور ارادہ پیدا کرتا ہے جو بالآخر ایک پختہ عزم کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔

کوئی کام خواہ چھوٹا ہو یا بڑا ———

اس کے لیے یہ داخلی عمل ضروری ہوتا ہے جس کا ایک سلسلہ ہر وقت ہمارے باطن میں جاری رہتا ہے۔

پھر خارجی عمل کی جس قدر تکرار ہوتی ہے داخلی عمل اسی قدر آسان ہوتا چلا جاتا ہے اور دشواریٔ عمل میں کمی آتی چلی جاتی ہے۔

اگر آپ نے کسی خاص نوعیت کا کوئی کام کبھی انجام نہ دیا ہو بلکہ وہ کام کبھی آپ کے تصور میں بھی نہ آیا ہو تو اندازہ کیجیے ———

اس کا انجام دینا کس قدر مشکل ہوگا؟

ایسے کسی کام کو انجام دینے کے لیے پہلے تو آپ کو ایک ایسے داخلی اور ذہنی عمل سے گزرنا ہوگا جس کی پہلے سے آپ نے تیاری نہیں کی ہوگی اور پھر ضروری وسائل کی فراہمی کے لیے تکلیف و مشقت برداشت کرنی ہوگی۔ تاہم اگر آپ نے

پیشِ نظر کام کو ایک بار انجام دے لیا تو یہ کام آپ کے لیے آسان ہو جائے گا۔ اس کام کے دوبارہ انجام دینے میں پہلے جیسی زحمت اور مشکل پیش نہیں آئے گی بس ذرا سی توجہ سے آپ اس کام کو پہلے کی طرح انجام دے دیں گے۔ جتنی زیادہ بار آپ اس کام کو انجام دیں گے اس کے کرنے میں زحمت کم ہوتی چلی جائے گی۔

کسی عمل کے بار بار اعادے اور تکرار کا نتیجہ یہ نکلتا ہے ———

کہ اس عمل کی باطنی صورت ہر وقت انسان کے ادراک و شعور میں حاضر رہتی ہے اور ذرا سی توجہ سے وہ ظاہر ہو کر عمل کا لباس پہن لیتی ہے اور مطلوبہ عمل اس قدر آسان ہو جاتا ہے ———

جیسے پھیپھڑوں کے لیے سانس لینا ———

آنکھوں کے لیے دیکھنا ———

اور زبان کے لیے کلام کرنا آسان ہو جاتا ہے۔

کبھی ایمان کی شدّت کسی مقصد کے لیے ٹھیک اسی تکرارِ عمل کا کام انجام دیتی ہے۔

اسی لیے ایمان اور احساسات کی پیوستگی سے جو عمل ظاہر ہوتا ہے اسے خُلق کا نام دیا جاتا ہے چنانچہ اخلاق کو ملکات کا اور ان صورتوں کا نام دیا گیا ہے جو نفسِ انسانی میں ثبت ہیں جن کے اثر سے ایک مربوط و منظّم عمل آسانی سے انسان سے سرزد ہوتا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ اخلاق کو کبھی تکرارِ عمل کے ذریعہ اور کبھی حسنِ عمل کو ابھار کر ——— اور کبھی ——— ان دونوں ذرائع سے حاصل کیا جاتا ہے

کمزور دل کا انسان بھی ———

جب بار بار خطرات سے دوچار ہوتا ہے تو پھر خطرات اس کی نظر میں

کوئی اہمیت نہیں رکھتے ۔ وہ کبھی کسی موثر تلقین وتبلیغ یا کسی جذبات ابھارنے والی تحریک کے تحت خود کو موت کے منہ میں جھونکنے کے لیے آمادہ ہو جاتا ہے ۔

حقیقت یہ ہے کہ تکرارِ عمل سے پیدا ہونے والی صفت میں عقیدے کی تاثیر آجاتی ہے (یہ علمی صورت ہے)

تکرارِ عمل، انسان کے ذہن میں برابر یہ بات ڈالتی رہتی ہے کہ وہ بغیر کسی رکاوٹ کے حرکت وعمل کر سکتا ہے اور عمل کرنا اس کے لیے ممکن و آسان ہے یہاں تک کہ عمل کا ممکن ہونا اور عمل کا پرکشش ہونا اس کی نگاہوں میں ——

اس طرح مجسم ہو جاتا ہے کہ ——

بے عملی اور جمود کا کوئی تصوّر اس کے ذہن میں نہیں آسکتا ۔

البتہ بعض خاص حالات میں انسان ایک مختلف کیفیت سے دوچار ہوتا ہے —— جیسے اچانک کسی خوفناک درندے سے اس کا سامنا ہو جائے

تو خوف و دہشت کی بنا پر ——

بھاگنے کا خیال ہی اس کے ذہن سے نکل جائے گا اور وہ خوف کے مارے ایک لکڑی کی طرح زمین میں گڑ جائے گا ۔

عمل نہ کرنے اور بے حرکت پڑے رہنے کا خیال صرف ان لوگوں کے ذہن میں آسکتا ہے جو فضول خیالات کی دنیا میں رہتے ہیں ——

جیسے افیون اور دیگر منشیات کے عادی لوگ ——

جو قوتِ عمل سے محروم ہو چکے ہیں ۔

منشیات سے روح اور جسم کو جو نقصان پہنچتا ہے اس سے یہ لوگ بخوبی واقف ہیں لیکن وہ کم عقلی کی بنا پر ——

ان مہلک چیزوں سے نجات حاصل کرنے سے قاصر ہیں ۔

بحث کا نتیجہ

ہماری اس بحث سے یہ بات پوری طرح واضح ہو چکی ہے کہ اخلاق کا مقام علم وعمل کے درمیان واقع ہے ——

دوسرے الفاظ میں ——

اخلاق کا رشتہ ایک طرف علم سے ہے تو دوسری طرف ——

عمل سے بھی ہے ۔

اخلاق، اچھے اعتقاد اور عمل کے ساتھ مل کر تشکیل پاتا ہے اور جب یہ انسان کے اندر اچھی طرح جڑ پکڑ لیتا ہے تو وہ اس کی ایک باطنی صفت بن جاتا ہے ——

اور خُلق کے نام سے پکارا جاتا ہے ——

اگر انسان بعض اسباب کی بنا پر اپنے اعتقادات سے پھر جائے تو وہ اچھے اخلاق سے بھی محروم ہو جائے گا ۔

اسی طرح اگر انسان عقیدے کے مطابق عمل نہ کرے گا یا اس کے خلاف عمل کرے گا تو بتدریج اس کے اچھے اخلاق رو بہ زوال ہو جائیں گے ۔

یہاں تک کہ وہ ان سے بالکل ہی خالی ہو جائے گا ۔

حقیقت یہ ہے کہ اخلاق کی حفاظت ایک طرف سے عمل کرتا ہے تو دوسری طرف سے اعتقاد اور ایمان اس کی حفاظت کرتے ہیں ۔

اگر کسی شخص کا ایمان، اپنی حرمت کی حفاظت پر نہیں ہے تو وہ کبھی بھی شجاعت کی صفت سے متصف نہیں ہو سکے گا ۔

اسی طرح ایک ایسا شخص جس کے ساتھ کیسا ہی ہتک آمیز برتاؤ

کیوں نہ کیا جائے اور اس کی عزت و شرافت پر کیسے ہی حملے کیوں نہ کیے جائیں، وہ سب کچھ خاموشی سے برداشت کرے اور اپنے دفاع کے لیے ہاتھ نہ ہلائے اور اپنی جگہ سے ٹس سے مس نہ ہو ———

تو وہ ہمیشہ شجاعت جیسی اعلیٰ صفت سے محروم رہے گا۔

اب اس بات کی تردید ہوگئی جو عموماً کہی جاتی ہے کہ:

"معاشرے میں اچھی صفات کو رائج کرنے کا کوئی طریقہ نہیں ہے۔"

کسی بھی چیز کو معاشرہ میں جاری و نافذ کرنے کے لیے اس کے مناسب حال مؤثر عامل کی ضرورت ہوتی ہے ———

جہاں تک اخلاق کا معاملہ ہے ———

انھیں ایک طرف اعتقاد کے ذریعے اور دوسری طرف معتقدات پر عمل کے ذریعہ درست کیا جا سکتا ہے ———

اور پھر ———

تقویتِ ایمان اور نگہبانی عمل کے ذریعہ اخلاق کی حفاظت کی جا سکتی ہے۔

کس طرح اس بات کا تصور کیا جا سکتا ہے کہ معاشرہ کے افراد ایک ایسے صحت مند ماحول میں زندگی بسر کریں جس میں اچھے اعمال کو فروغ حاصل ہو اور وہ اپنی خوش نصیبی اور کامرانی بھی ایمان اور اس کے اثرات میں سمجھتے ہوں اس کے باوجود ان کے اخلاق کو وہ محافظ و نگہبان میسر نہ آئے جسے ایمان و اعتقاد کا نام دیا جاتا ہے ——— !

دنیا کے متمدن ممالک کے بارے میں ہم یہ بات بخوبی جانتے ہیں کہ وہاں

ملکی قوانین و ضوابط کو پوری طرح نافذ کیا جاتا ہے اور ان معاشروں کے افراد اپنی اجتماعی ذمہ داریوں اور فرائض سے بخوبی واقف ہوتے ہیں اور ان کی سختی سے پابندی کرتے ہیں۔

اچھے اخلاق کو ایک عام قانون و ضابطے کی حیثیت دے کر ———

وہ طاقتور اور مضبوط ہیں ———

وہ ایک دوسرے سے جھوٹ نہیں بولتے ———

ظلم و ستم سے پرہیز کرتے ہیں ———

وہ وطن فروشی نہیں کرتے ———

اپنے قانون اور مقدسات کی اہانت نہیں کرتے۔

ایسے معاشروں میں اگر کسی گوشے میں برے اخلاق ظاہر ہوتے ہیں تو ان کی حیثیت استثنائی ہے۔ تمدن کے باوجود کچھ چیزیں قانون کے خلاف موجود رہتی ہیں۔

اگر اخلاق کو عمل کی پشت پناہی حاصل نہ ہو، جیسے جنسی آوارگی سے پرہیز، برے اخلاق اور شراب نوشی سے پرہیز، تو طاقتور حکومتیں بھی اپنے وسیع ذرائع ابلاغ کے باوجود انھیں معاشرہ میں رائج نہیں کر سکتیں۔ حتیٰ کہ وہ منافی اخلاق چیزوں کو بھی متزلزل نہیں کر سکتیں اور ان کی پروپیگنڈا مشینری کو ہر روز ایک تازہ شکست کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ ———

جن ممالک میں شراب کو پانی کی طرح استعمال کیا جاتا ہو اور بچوں تک کو شراب پلائی جاتی ہو اور ہر سال لاکھوں ٹن الکحل کی مشروبات تیار ہوتی ہوں ——— اور ——— بوس و کنار اور بے حیائی کو کھلا رواج

حاصل ہو چکا ہو وہاں ذرائع ابلاغ کو خواہ کس قدر وسیع پیمانے پر استعمال کیا جائے نتیجہ صفر ہی رہے گا ———

ایسے ممالک میں ———

اخلاق پر زور دینے والی ہزاروں نشریات کا جواب ———

کوئی ایک شعر ہوگا ———

جو شیکسپیئر اور لامارٹن نے شراب اور محبوب کی تعریف میں کہا ہوگا۔

متمدن دنیا کے اخلاقی انحطاط کا سبب یہ نہیں ہے کہ اخلاق کو رائج کرنے والا کوئی مؤثر عامل موجود نہیں ہے بلکہ اس کا سبب یہ ہے کہ رائج قوانین کو اس طرح مرتب نہیں کیا گیا ہے کہ وہ انسانی اخلاقِ فاضلہ سے پوری طرح ہم آہنگ ہوں۔

اس بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ ———

اخلاق کا پیدا ہونا اور ان کا باقی رہنا عقیدہ اور عمل سے وابستہ ہے۔

ان دونوں کا بقا و زوال اخلاق پر گہرا اثر ڈالتا ہے۔

اب یہ دیکھا جائے کہ کیا عمل کو ایمان و عقیدے اور اخلاق کے ساتھ وہی ربط حاصل ہے، اسی طرح کیا ایمان و عقیدے کو اخلاق کے ساتھ ویسا ہی تعلق میسّر ہے؟

کیا ان تینوں کے درمیان بھائیوں کا سا رشتہ ہے یا باپ اور بیٹے جیسا۔ اسلامی قوانین میں ان تینوں کے درمیان روابط کو کس حد تک ملحوظ رکھا گیا ہے اور دوسرے اجتماعی فلسفے ان کے بارے میں کیا نظریہ رکھتے ہیں یہ سوالات ایک طویل بحث کے متقاضی ہیں۔ ہم نے اوپر جو مختصر بحث کی ہے اس سے ان سوالات کا ایک اجمالی جواب مل سکتا ہے۔

*

۷

اسلام اور تشیّع میں اجتہاد اور تقلید

اجتہاد وتقلید، ان دونوں مذہبی اصطلاحات سے ہم مسلمان بخوبی واقف ہیں۔ یہ الفاظ اپنے معنی کے اعتبار سے ایک دوسرے کی ضد ہیں۔

(ہم اجمالی طور پر ان کے مفہوم سے بھی آشنا ہیں)

البتہ کوئی شخص کسی مردہ مجتہد کی تقلید سے ابتدا نہیں کرسکتا۔ یہ مسلّمہ امر ہے۔ تقلید کی ابتدا کرنے کے لیے زندہ مجتہد کی تقلید ضروری ہے اور اس کے انتقال کے بعد اس کی تقلید پر باقی رہا جاسکتا ہے۔

(یہ نکتہ متنازعہ ہے)

ہر مجتہد کی وفات کے بعد اس کے مقلدین کے لیے یہ ضروری ہوتا ہے کہ وہ کسی زندہ مجتہد کا اتباع اور تقلید اختیار کریں۔

اجتہاد وتقلید کی اصطلاحات کا دوسرے تمام اسلامی فرقوں کی بہ نسبت مذہبِ شیعہ میں بہت زیادہ تذکرہ رہتا ہے۔

ہم مسلمان ان دونوں الفاظ کے اجمالی مفہوم سے تو واقف ہیں لیکن اسلامی تاریخ اور علوم کے مطالعہ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وفات کے بعد اجتہاد کا لفظ صحابہ وتابعین کے درمیان موجودہ معروف معنوں

کے علاوہ ایک دوسرے معنی میں بھی استعمال ہوتا رہا ہے۔ ہم اس مقالے میں اجتہاد وتقلید کے اس مفہوم کو زیرِ بحث لانا چاہتے ہیں جو آج معروف ہے اور دین کے ساتھ اس کے گہرے تعلق پر بھی ہم بحث کریں گے۔ اس کے ساتھ ہم ان دوسرے معانی سے بھی اعراض نہیں کریں گے جو ایک تاریخی پہلو رکھتے ہیں۔

اجتہاد وتقلید کا تفصیلی مفہوم اور دین کے ساتھ اس کے تعلق کی نوعیت معلوم کرنے کے لیے ان چند باتوں کا ذکر ضروری ہے۔

سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ:

شیعہ نقطۂ نظر سے اسلام کا پاکیزہ آئین ایک طرف تو دنیا وآخرت کے بارے میں حقیقی علم عطا کرتا ہے تو دوسری طرف اصول اخلاق کے ساتھ ایسے جامع قوانین وضوابط بھی دیتا ہے جو اجتماعی زندگی کے تمام شعبوں کا احاطہ کرتے ہیں اور ہر انسان کو خواہ وہ سیاہ رنگ رکھتا ہو یا سفید ————

عربی ہو یا عجمی ————

عورت ہو یا مرد ———— اس بات کا پابند بناتا ہے کہ وہ اپنے انفرادی اور اجتماعی اعمال کو ان قواعد وقوانین کے مطابق بنائے جن کے مجموعے کا نام شریعتِ اسلامی ہے اور صرف ————

اسی قانونِ اسلامی کی اتباع کرے۔

لیکن کسی عمل کو متعلقہ حکم وقانون کے مطابق بنانے کے لیے اس قانون کے متن سے واقفیت ضروری ہوتی ہے۔

اسی لیے ————

اسلام کے اصولی اور فروعی احکام کا علم حاصل کرنا ————

مسلمانوں کے فرائض میں سے ہے۔

عقلی اعتبار سے بھی یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچتی ہے اور کتاب و سنت کے بیانات بھی اس کی تائید کرتے ہیں[1]

---

[1] عقلاً اس بات کی تردید نہیں کی جاسکتی کہ انسان جس کام سے واقف نہیں ہوتا اسے وہ انجام نہیں دے سکتا۔ کوئی فرض اسی وقت عائد ہوتا ہے جب اس کے ادا کرنے کی قدرت حاصل ہو۔ اختیار و قدرت کے بغیر فرض کا عائد کرنا عقلاً جائز نہیں ہے۔ جن احکام و نواہی کی رو سے دینی فرائض عائد ہوتے ہیں ان ہی احکام کی رو سے ان دینی فرائض کا علم حاصل کرنا بھی لازم ہوجاتا ہے آیاتِ قرآنی سے بھی اس بات کی تائید ہوتی ہے جیسے لایکلف اللہ نفسا الّا وسعھا (البقرۃ آیت ۲۸۶) اور آیت لایستطیعون حیلۃ ولایھتدون سبیلاً۔ ترجمہ (مگر وہ مرد اور عورتیں اور بچے جنھیں قدرت حاصل نہیں ہے وہ نہ کوئی تدبیر سوچ سکتے ہیں اور نہ اپنے مقصد کے لیے کوئی راہ پاتے ہیں) اور دوسری آیت ان اللہ لا یظلم الناس شیئاً۔ ترجمہ (حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ لوگوں پر کوئی ظلم روا نہیں رکھتا) پھر وہ آیات بھی ہیں جو مواخذہ سے پہلے اتمامِ حجت کو ضروری قرار دیتی ہیں جیسے آیتِ قرآنی لئلا یکون الناس علی اللہ حجۃ اور ایسی ہی دوسری آیات۔ اسی طرح بہت سی وہ روایات ہیں جو جاہل مجبور شخص کو معذور قرار دیتی ہیں اور فرائض سے متعلق حصولِ علم کو لازم قرار دیتی ہیں جیسا کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا فرمان طلب العلم فریضۃ علی کل مسلم اور "مجالس" میں شیخ مفید نے اپنی سند سے امام ششم سے روایت کی ہے کہ قیامت کے روز اللہ تعالےٰ اپنے بندے سے پوچھے گا۔ کیا تو جانتا تھا؟ اگر وہ اثبات میں جواب دے گا تو پھر اللہ تعالیٰ پوچھے گا جس چیز کو تو جانتا تھا اس پر تو نے عمل کیوں نہیں کیا۔ اگر بندہ یہ کہے گا کہ میں نہیں جانتا تھا تو اللہ تعالیٰ فرمائے گا کیوں تو نے علم حاصل نہیں کیا (باقی اگلے صفحہ پر)

دوسری بات یہ ہے کہ

قرآن و سنت میں جو ہدایات دی گئی ہیں وہ اصولی ہیں اور ان کی تعداد محدود ہے، جبکہ انسانی زندگی میں پیش آنے والے حوادث اور واقعات اور ان سے پیدا ہونے والے مسائل بے شمار اور لامحدود ہیں اور ان کے بارے میں احکام اور احکام کی جزئیات و تفصیلات معلوم کرنے کے لیے فکر و استدلال کی راہ کے سوا اور کوئی راہ نہیں ہے

اور یہ بات بھی واضح ہے کہ ———

دینی تعلیمات و ہدایات میں بھی اس مقصد کے لیے اسی راہ کی جانب رہنمائی کی گئی ہے۔

دینی احکام و فرائض کے تعین کے لیے وہی راہ اختیار کی جانی چاہیئے جو کسی بھی معاشرہ کے دانشور انفرادی و اجتماعی فرائض کی تشخیص کے لیے اختیار کرتے ہیں۔

وہ ان فرائض کا تعین ———

کلّی اور جزئی قوانین و دساتیر کی روشنی میں کرتے ہیں ———

دوسرے الفاظ میں ———

فرائض و ذمہ داریوں کے تعین کا کام کچھ قواعد و ضوابط کے تحت انجام دیا جاتا ہے۔ ایسے ہی کچھ قواعد و ضوابط کے مطابق دینی ہدایات سے شرعی فرائض اور احکام کا استنباط ہونا چاہیئے۔

(بقیہ حاشیہ گزشتہ سے پیوستہ) کہ اس کے مطابق عمل کرتا۔ نتیجۃً بندہ قصوروار قرار پائے گا اور حجتِ بالغہ کا یہی مطلب ہے۔ ارشاد خداوندی ہے وللہ الحجۃ البالغۃ۔

جو شخص بھی ائمہ دینؑ کے اقوال و تعلیمات کی پوری طرح تحقیق کرے گا تو اس
کے علم میں ایسے بہت سے مواقع آئیں گے جہاں ائمہ دینؑ نے اپنے ساتھیوں اور
اپنے متبعین کو تعلیم دیتے ہوئے یا مخالفین سے بحث و مناظرہ کرتے ہوئے خدا
کی کتاب اور پیغمبرؐ کی سنّت سے عمومی طریقے پر استنباط کیا ہے۔

آج ہم اجتہاد کا لفظ ان ہی معنوں میں استعمال کرتے ہیں۔ اجتہاد کا
مطلب دینی ہدایات سے فکر و استدلال کے ذریعہ شرعی حکم معلوم کرنا ہے۔

اجتہاد کا عمل چند قواعد کے تحت انجام دیا جاتا ہے ———

اور یہ قواعد ———

قواعد اصولِ فقہ کہلاتے ہیں۔

نتیجۂ بحث

اس بحث سے یہ نتیجہ برآمد ہوتا ہے کہ اسلام نے مسلمانوں کی جماعت پر
جو فرائض عائد کیے ہیں ان میں سے ایک فریضہ یہ ہے کہ وہ اجتہاد کے طریقے سے
دین کے احکام کی تشخیص کرے ———

اور یہ بات بھی واضح ہے کہ ———

تمام افراد کے لیے اس فریضے کی ادائیگی ممکن نہیں ہے۔ صرف
لوگوں کی ایک محدود تعداد ہی کو اس فریضے کے ادا کرنے کی قوت و ہمت
حاصل ہو سکتی ہے اور یہی چند لوگ احکام و ہدایاتِ دینی کا گہرا مطالعہ کر کے اور
ان پر غور و فکر کر کے اور استنباط کے قواعد کے توسط سے اسلام کے احکام و ضوابط
مرتب کر سکتے ہیں۔

تمام لوگوں کا دینی احکام میں اجتہاد کرنے سے قاصر رہنا اور احکام

دین کا علم حاصل کرنے کو ایک فریضے کی حیثیت حاصل ہونا۔ یہ دونوں باتیں اس بات
کا سبب بنی ہیں کہ وہ لوگ جو اجتہاد کرنے کی صلاحیت و قوت نہیں رکھتے خود کو
ایک دوسرے فریضے کا پابند سمجھیں ———

اور وہ فریضہ یہ ہے کہ

وہ اپنے درپیش مسائل سے متعلق دینی احکام ان لوگوں سے معلوم کریں
جو اجتہاد و استنباط کی صلاحیت رکھتے ہیں ———

تقلید کے معنی یہی ہیں ———

اور یہ اصطلاح اجتہاد کے مقابل استعمال کی جاتی ہے۔

جاہل کے لیے تقلید کا حکم ثابت کرنے کی بہترین دلیل مسلمانوں کا وہ مسلسل عمل
ہے جو اسلام کے دورِ اوّل سے لے کر آج تک ان کے درمیان جاری رہا ہے
وہ مسلمان جن میں اجتہاد کی صلاحیت و قوت نہیں رہی ہے اور شرعی احکام و دینی
معارف کا علم حاصل کرنے سے قاصر رہے ہیں ———

وہ قابلِ اعتماد علماء سے رجوع کر کے ———

اپنے مسائل کے بارے میں ان سے دینی احکام معلوم کرتے رہے ہیں۔

اس سے قطع نظر خود کتاب و سنّت میں ایسے شواہد موجود ہیں جن سے
جاہل شخص کے لیے تقلید کے لازم ہونے کا حکم نکلتا ہے ———

جیسے وہ آیات جو جاہل کو عالم کی اتباع کرنے کی دعوت دیتی ہیں اور
پھر وہ روایات ہیں جو تقلید کے بارے میں ہیں ———

یا جن میں بعض صحابہ کو فتویٰ دینے کی ترغیب دی گئی ہے۔

اسی طرح کی کچھ دوسری روایات جن میں صراحتاً یا اشارتاً مسئلۂ تقلید کو
اٹھایا گیا ہے۔

اب تک ہم نے جو بحث کی ہے اس سے اجتہاد و تقلید کے معنی اور دین سے اس کا تعلق پوری طرح واضح ہو گیا ہے لیکن اجتہاد و تقلید کا موضوع بڑی وسعت رکھتا ہے اور اجتہاد و تقلید کے طریقے سے واقفیت حاصل کرنا انسانی زندگی کی ایک بنیادی ضرورت ہے ——————

اس لیے اس موضوع پر ایک عمیق و دقیق بحث درکار ہے۔

یہ انسان کی فطرت ہے کہ جب وہ کسی مسئلے میں اجتہاد کرنے سے قاصر رہتا ہے تو تقلید کی راہ اختیار کرتا ہے۔

اسی بنا پر اسلام کا اجتہاد و تقلید کا دستور اس راہ کی جانب رہنمائی کرتا ہے جس کی طرف خود انسانی فطرت اشارہ کرتی ہے۔

انسان دوسری مخلوقات کی طرح اپنا ایک وجود رکھتا ہے اور اپنے وجود کی مناسبت سے زندگی کا ایک ہدف رکھتا ہے اور اس مخصوص ہدف تک پہنچنے کے لیے اسے مناسب اعضا، قوتیں اور وسائل فراہم کیے گئے ہیں۔

اور وہ اپنی زندگی کے اصل اور آخری ہدف کو حاصل کرنے کے لیے ان قوتوں اور وسائل کو استعمال میں لاتا ہے اور ہر ممکن جدوجہد کرتا ہے۔

مقاصدِ زندگی کے لیے اس کی یہ جدوجہد ایک ایسی ارادی جدوجہد ہے جو اس کے نظریے اور فکر سے قوت حاصل کرتی ہے۔ انسان حالات زمانہ کا اور تمام میسر مادی وسائل کا جائزہ لیتا ہے اور پھر اپنی تمام کوششوں کو نفع و نقصان اور خیر و شر کی کسوٹی پر رکھ کر انھیں پرکھتا ہے اور جس کام کو اپنے مقاصدِ حیات کے لیے مفید پاتا ہے اسے انجام دینے کے لیے قدم اٹھاتا ہے۔

یہ ہماری خداداد فطرت ہے کہ ہم جب تک کسی چیز کے اسباب و علل اور لوازم و آثار کو اچھی طرح دیکھ اور سمجھ نہیں لیتے اس وقت تک اس چیز کے وجود اور

اس کی واقعیت کے بارے میں فیصلہ نہیں کرتے، اسی طرح جب تک ہمیں کسی کام کے نتائج اور فوائد کا اچھی طرح اندازہ نہیں ہو جاتا اس وقت تک ہم اس کو انجام دینے کا ارادہ نہیں کرتے۔

یہ ہمارا عینی مشاہدہ ہے کہ دنیا میں رونما ہونے والی ہر نئی چیز اور ہر نئے واقعہ کا ہمارے حواس میں سے کسی نہ کسی حس پر انعکاس ہوتا ہے، حتیٰ کہ ایک ہلکی سی آواز بھی ہمارے کانوں میں پہنچتی ہے تو ہم اس کا سبب معلوم کرتے ہیں

اگر ہم کوئی کام انجام دینا چاہتے ہیں ——————

تو پہلے اسے انجام دینے یا اسے ترک کرنے کے فوائد کا جائزہ لیتے ہیں۔

ہمارے اس ذہنی اور فکری عمل کو علمی اصطلاح میں "استدلال" کہا جاتا ہے۔

پس انسان اپنی فطرت اور اپنی طبعی ساخت کی بنا پر ایک ایسی مخلوق ہے جو فکر و استدلال سے کام لیتی ہے اور علمی نظریات اور عملی فیصلوں کے لیے انسان استدلال کا طریقہ اختیار کرتا ہے۔

اس کی علمی احتیاجات اور معلومات اتنی زیادہ اور بے حد و حساب ہیں کہ کوئی انھیں شمار نہیں کر سکتا۔

کجا کہ کسی ایک شخص کی عقل و دانش ——————

ان کی تمام جزئیات کا احاطہ کر کے ان کے اچھے اور بُرے ہونے اور حق و باطل ہونے کا تعین کر سکے۔

البتہ انسان ایک اجتماعی اور مدنی زندگی اختیار کر کے ——————

—————— زندگی سے متعلق مختلف کام باہم تقسیم کر سکتا ہے۔

اس حقیقت کو سمجھ لینے کے بعد انسان کے لیے صرف یہی راہ باقی رہ جاتی ہے کہ وہ زندگی کے جن امور اور شعبوں میں عمل دخل رکھتا ہے ان کے بارے میں

پوری واقفیت حاصل کرے اور ان میں خاص مہارت پیدا کرے اور فکر و اجتہاد سے کام لے ——

اس کے برعکس ——

زندگی کے جن شعبوں کے بارے میں اسے علم و مہارت حاصل نہیں ہے ان میں وہ ایسے اشخاص کی تقلید اور پیروی کرے جو اُن شعبوں میں مہارت اور علم رکھتے ہیں اور جن کی مہارت اور قابلیت پر اسے اعتماد ہو ——

—— ان کے علمی فیصلوں کو قبول کرے اور اپنے عمل کو ان کے علم اور ان کی فکر و نظر کے مطابق بنائے ——

اس کو تقلید کہتے ہیں۔

ہم جو بھی کام کرنے کا ارادہ کرتے ہیں۔ پہلے اسے سمجھنے اور سیکھنے کی کوشش کرتے ہیں اور ایسے شخص سے رجوع کرتے ہیں جو اس کام سے پوری طرح واقف ہو، اور ماہر فن ہو ——

اگر ہم کوئی پیشہ یا صنعت اختیار کرنا چاہتے ہیں تو کسی ماہر استاد کو تلاش کرتے ہیں ——

اپنے دکھ درد اور بیماری کے علاج کے لیے ڈاکٹر کے پاس جاتے ہیں۔

اگر کوئی عمارت تعمیر کرنا چاہتے ہیں تو انجینئر کی خدمات حاصل کرتے ہیں۔

انسانی معاشرہ میں تعلیم و تربیت کا یہی طریقہ رائج ہے۔

گزشتہ بحث سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ اجتہاد و تقلید کا مسئلہ اہم ترین انسانی مسائل میں سے ایک ہے۔ جو شخص بھی مدنی اور معاشرتی زندگی کے دائرے میں قدم رکھنا چاہتا ہے اسے اجتہاد و تقلید کی راہ اختیار کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ ہر انسان زندگی کے دائروں میں سے ایک

بہت ہی چھوٹے دائرے کے اندر خود اجتہاد سے کام لیتا ہے اور دوسرے دائروں میں جو زندگی کا زیادہ بڑا حصّہ ہیں، تقلید کی راہ اختیار کرنے پر مجبور ہے ——

سچ ہے کہ ——

جو شخص اس تصور میں مبتلا ہو کہ اسے کسی کی تقلید کی ضرورت نہیں ہے وہ ایک بڑی غلط فہمی اور مضحکہ خیز خود فریبی کا شکار ہے۔

تیسری بات یہ کہ ——

فطرت اور رائے عامہ کی رو سے ——

تقلید صرف اس انسان کیلئے لازم ہے جو جاہل ہو اور اس میں اتنی علمی اور فکری صلاحیت موجود نہ ہو کہ خود کسی مسئلہ کو سمجھ سکے اور اس کا حکم معلوم کر سکے اور جسے ایسے باعلم و صلاحیت پیشوا کی ضرورت ہوتی ہے جس پر وہ اعتماد کر کے اس کی اتباع کر سکے۔

اس کے برعکس صورت میں ——

تقلید کی راہ اختیار کرنا ناپسندیدہ ہے۔

اس بحث کا اولین حاصل یہ ہے کہ اجتہاد و تقلید کی راہ ایک فطری راہ ہے۔ کتاب و سنت کے روشن بیانات سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ

اسلام دینِ فطرت ہے ——

اور وہ انسانوں کو زندگی کے انھیں طریقوں کی طرف دعوت دیتا ہے جن کی طرف خود اس کی فطرت رہنمائی کرتی ہے۔

اللہ تعالیٰ اپنی کتاب مجید میں فرماتا ہے:

" فَأَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّينِ حَنِيفًا ۚ
فِطْرَتَ اللَّهِ الَّتِي فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا ۚ

لَاتَبْدِيْلَ لِخَلْقِ اللّٰهِ ؕ ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ ۙ

(سورہ روم آیت ۳۰)

"پس یک سُو ہو کر اپنا رُخ اس دین کی سمت میں جما دو۔ قائم ہو جاؤ اس فطرت پر جس پر اللہ تعالیٰ نے انسانوں کو پیدا کیا ہے اللہ کی بنائی ہوئی ساخت بدلی نہیں جا سکتی۔ یہی بالکل راست اور درست دین ہے۔"

اجتہاد و تقلید چونکہ بنیادی فطری مسائل میں سے ہے اس لیے دینِ اسلام

جو فطرت کی راہ اختیار کرنے کی دعوت دیتا ہے ——————

اجتہاد و تقلید کے طریقے کو اپنانے کی ہدایت کرتا ہے ——

اندھی تقلید کے خلاف جہاد

آخر میں ہم یہ واضح کر دیں کہ ——————

ہم نے جس تقلید کا ذکر کیا ہے وہ اندھی تقلید نہیں ہے ——

اور ——————

ایسی تقلید نہیں ہے جو بے سمجھے بوجھے کی جاتی ہے۔ اسلام پوری قوت کے ساتھ ایسی تقلید کے خلاف جہاد کرتا ہے۔ اور قرآن ایسی تقلید کو رذیل ترین اور بدترین صفاتِ انسانی میں سے ایک صفت قرار دیتا ہے [1]

---

[1] جیسا کہ آیتِ قرآنی میں ارشاد ہوا ہے

قالوا بل نتبع ما الفینا علیہ آباءنا اولو کان (باقی اگلے صفحہ پر)

اور ان لوگوں کو جو اپنے آباؤ اجداد ——————

اور دنیا پرست و مفاد پرست انسانوں کی اندھی پیروی کرتے ہیں

اور ہر آواز کے پیچھے چل پڑتے ہیں ——————

جانوروں میں شمار کرتا ہے ——————

کیونکہ ان لوگوں نے عقل و دانش کو پسِ پشت ڈال دیا ہے اور انسانیت کی اصل شان یعنی فکر و استدلال کو خاک میں ملا دیا ہے۔

(بقیہ حاشیہ گزشتہ سے پیوستہ) اباؤھم لا یعقلون شیئاً ولا یھتدون ○ ومثل الذین کفروا کمثل الذی ینعق بما لا یسمع الا دعاءً وندآءً ؕ صم بکم عمی فھم لا یعقلون (سورہ بقرہ آیت ۱۷۰) سورہ مائدہ کی آیت ۱۰۴ میں بھی اس آیت کے پہلے حصے کی طرح کا مضمون ارشاد ہوا ہے: ترجمہ: "جب ان سے کہا جاتا ہے کہ تم اس چیز کی پیروی کرو جسے خدا نے نازل کیا ہے تو یہ لوگ کہہ اٹھتے ہیں کہ ہم تو اس طریقے کی پیروی کریں گے جس پر ہم نے اپنے آباؤ اجداد کو پایا ہے کیا ان کے آباؤ اجداد ایسے نہیں تھے کہ نہ عقل رکھتے تھے نہ ہدایت رکھتے تھے اس کے باوجود وہ ان ہی کی پیروی کرنا چاہتے ہیں۔ ان لوگوں کی مثال اس شخص کی سی ہے جو جانوروں کو پکارتا ہوا اور وہ اس شخص کی آواز کے سوا اور کچھ نہیں سمجھتے۔ یہ لوگ سننے والے کان، بولنے والی زبان اور دیکھنے والی آنکھ سے محروم ہیں اور اس کے نتیجے میں وہ نہ کسی بات کو سمجھ پاتے ہیں اور نہ اپنی عقل سے کام لیتے ہیں۔"

انصاریان پبلیکیشنز

پوسٹ بکس نمبر ۳۷۱۸۵-۱۸۷

قم جمہوری اسلامی ایران

ٹیلی فون نمبر ۲۱۷۴۴